فہرست

لمعات:

سیلاب کی تباہ کاریاں	ادارہ	3
عیدمبارک	ادارہ	6
رویتِ ہلال	ادارہ	7
عیدکا چاند(نظم)	ثمینہ بلال	10
ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	مرتبہ بزم لندن	11
متحدہ اذان	جاوید چودھری	16
شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر مبارک کتنی تھی؟	بریگیڈیئر(ر) حامد سعید اختر	19
اللہ تعالیٰ کے انسانیت سے روابط کے طریقے	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی	30
علماء کون ہیں؟	غلام احمد پرویز	38
باب المراسلات	ادارہ	56

ENGLISH

Why Do We Celebrate Eid?
Bazm-e-Tolu-e-Islam London 1

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

سیلاب کی تباہ کاریاں

لا عاصم الیوم من امر اللہ (۱۱/۴۳) ''آج اس ابتلاء سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی'' کا جیتا جاگتا منظر آنکھوں کے سامنے آ جائے' قوموں کی زندگی میں ایسے حوادث کم آتے ہیں' لیکن قوم اور قوم میں فرق ہوتا ہے۔ اس طرح کے طبعی حوادث زندہ اقوام پر بھی آتے ہیں۔ اول تو انہوں نے اپنی پیش بینی سے پہلے ہی احتیاطی وحفاظتی تدبیریں اختیار کر رکھی ہوتی ہیں اور اگر معاملہ ان کی حد سے بڑھ جائے تو پوری قوم اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور متاثرین کو اس طرح سنبھال لیتی ہے کہ ان کو اپنے نقصان کا احساس تک نہیں ہوتا۔ حادثہ کے گزر جانے کے بعد عمائدین قوم سر جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور غور وفکر کرتے ہیں کہ ہماری تدابیر میں کیا کمی رہ گئی تھی اور اس کو آئندہ کیسے پورا کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ نہ ''عوام'' کو اس کا خیال ہے کہ ایسے حادثات وسانحات کا کوئی مستقل حل سوچنا چاہئے اور نہ ''لیڈروں'' کو اس کا احساس کہ زندگی کو کسی ڈھب پر گذارنے کی شکل پیدا کرنی چاہئے۔ آج سے پچاس سال قبل ''طلوع اسلام'' نے انہی صفحات پر' سیلاب کے تباہی مچانے کے بعد' ان الفاظ میں اربابِ حل و عقد کے سامنے دردمندانہ گذارش کی تھی اور بعد میں بھی بار بار دہراتا رہا کہ:

> ''اگر ہمارے ہاں خدمتِ خلق کے لئے ادارے موجود ہوں تو خدمت کا سلسلہ فی الفور شروع کیا جا سکتا ہے یہ ایسی کمی ہے جو ہمیں آفات وحوادث کے وقت بے چارا سا بنا دیتی ہے اور ہمارے نقصانِ جان و مال میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ اگر اب بھی اس نکتہ کو سمجھ لیا جائے اور ایسی (تربیت یافتہ کارکنان پر مشتمل) تنظیمیں قائم کر لی جائیں تو ملک کو بہت سے غیر ضروری مصائب سے بچایا جا سکتا ہے۔''

لیکن افسوس ہے کہ ہم آج بھی اسی مقام پر ہیں جہاں پر نصف صدی قبل کھڑے تھے۔

باقی رہے ہمارے مذہبی راہنما' سو جب کبھی اس طرح کے حوادث آتے ہیں تو وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان اور قوم کو تسکین دے لیتے ہیں کہ سب ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ کہنے کو تو وہ ہمارے گناہ کہتے ہیں لیکن اس سے ان کی مراد ہوتی ہے ارباب حکومت و قیادت کے گناہ۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہی وہ طبقہ ہے جو فسق و فجور میں مبتلا رہتا ہے اور اسی کی وجہ سے خدا کا عذاب آتا ہے۔ یہ خیال کہ طبعی حوادث' آندھیاں' سیلاب اور زلزلے خدا کا عذاب ہیں جو ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہم پر نازل ہوتا ہے اس قدر عام ہے کہ اس سے متعلق اکثر ہم سے لوگ پوچھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کو اس طرف آنے ہی نہیں دیا جاتا کہ فطرت کے حوادث کا علاج قوانین فطرت کے مطابق ہوتا ہے جس کے لئے تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ برعکس اس کے قوم کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہ مصیبت خدا کی طرف سے ہے اس لئے کوئی ان کی روک تھام نہیں کرسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان طبعی حوادث کو انسانوں کی نیکی اور بدی سے کوئی تعلق نہیں ہے اس میں کفر و ایمان کو بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ قطرینا و ریٹا کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔ قرآن کریم نے تسخیر فطرت کو آدمی کے لئے عام بتایا ہے۔ **سخر لکم ما فی السمٰوٰت والارض جمیعاً۔** یعنی کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے ہم نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اس کا مخاطب آدمی ہے کوئی خاص گروہ نہیں ہے۔ اس لئے دنیا کی جو قوم بھی چاہے تسخیر فطرت کرسکتی ہے' جو قوم ایسا کرے گی وہ طبعی حوادث کی تباہ کاریوں سے محفوظ ہو جائے گی اور جو ایسا نہیں کرے گی نقصان اٹھائے گی۔

قرآن نے زندگی کی ایک سطح حیوانی بتائی ہے۔ حیوان فطرت کو تسخیر نہیں کرسکتا۔ ایک درجہ آدمیت کا ہے۔ آدمی تسخیر کرسکتا ہے۔ تیسرا مقام مومن کا ہے جو متاع فطرت کو نوع انسانی کی پرورش کے لئے عام کرتا ہے۔ کوئی مقامِ مومن تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ مقامِ آدم تک نہ پہنچ جائے۔ بقول اقبالؔ:

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

مقامِ مومن مشکل ہے تو ہمیں ان حادثات طبعیہ سے بچنے کے لئے کم از کم مقام آدمیت تک آنا پڑے گا یعنی تسخیر فطرت کی صلاحیت حاصل کرنی ہوگی اور اس کے لئے قومی کردار پیدا کرنا پڑے گا۔ ہمارے لئے یہ ہیبت انگیز اور تباہ

کُن سیلاب فطرت کا ایسا اشارہ ثابت ہوسکتا ہے جس کو سمجھنے سے ہم اپنی تقدیر سنوار سکتے ہیں۔ ان اشاروں کو سمجھنے کے لئے جس شعور اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے جب اس سے اقوام آگاہ ہوتی ہیں تو ان کی اجتماعی زندگی کے مظاہر محیر العقول ہو جاتے ہیں۔

ایک عظیم قرآنی خزانہ

قرآن مجید پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے خوشخبری

مفکرِ قرآن مجید علامہ پرویزؒ صاحب کی زندگی بھر کی قرآنی بصیرت کو DVD پر دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔

قیمت 20 کراؤن فی سی۔ڈی علاوہ ڈاک خرچ میں طلب کیجئے۔

سی ڈی اور کتب کی خریداری

☆ بیرون ملک bazmdenmark@gmail.com

☆ اندرون ملک، فون: 5753666 42 92+، ای میل: trust@toluislam.com

نظریۂ خیر

ادارہ طلوع اسلام کے چیئرمین ڈاکٹر انعام الحق صاحب کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ بعنوان ''نظریۂ خیر، فلسفۂ اخلاق اور قرآن کی روشنی میں'' شائع ہو گیا ہے۔ یہ فکر انگیز تصنیف ادارہ طلوع اسلام 25بی، گلبرگ 2، لاہور سے دستیاب ہے۔ 534 صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/300 روپے ہے۔ 50 فی صد کی خصوصی رعایت کے بعد صرف -/150 روپے میں علاوہ ڈاک خرچ ادارہ طلوع اسلام سے دستیاب ہے۔

بایزید یلدرم

صابر صدیقی صاحب کا نام طلوع اسلام کے حلقوں میں تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ طلوع اسلام ٹرسٹ سے ان کی کتابیں ابلۂ مسجد، اور کن فیکون شائع ہو کر قارئین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ''بایزید یلدرم'' ان کا ایک تاریخی ناول ہے جو انہوں نے بہت محنت سے لکھا ہے۔ یہ ناول ادارہ طلوع اسلام سے رعایتی قیمت -/150 روپے علاوہ ڈاک خرچ میں دستیاب ہے۔

عید مبارک

جشنِ نزولِ قرآن مجید

پر

دلی ھدیہ تبریک قبول فرمایئے

اے نوعِ انسانی!

تمہارے پاس تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات آ گیا ہے جو ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے سینوں کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے۔ جو قوم اس کی صداقتوں پر یقین رکھتی ہے یہ اس کی راہنمائی، زندگی کی منزلِ مقصود کی طرف کرتا ہے اور اسے سامانِ نشوونما سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔

کہو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے عطا ہوا ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ ایسے ضابطۂ حیات کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ اس تمام ساز و سامان سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے ہو۔ (القرآن الکریم، یونس 10، آیت 58)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رویتِ ہلال

علماء اور حکومتِ وقت کے لئے ایک تجویز

جن مہینوں کے پہلی تاریخ کے چاند کو ہمارے معاشرے میں خاص اہمیت حاصل ہے ان میں شاید ہی کوئی مہینہ ایسا ہو جس کی رویتِ ہلال میں ہر سال اختلاف نہ ہوتا ہو۔ اس اختلاف کو دور کرنے کی اپیل کیجئے تو فوراً ایک ''حدیث'' پڑھ کر سنا دی جاتی ہے کہ ''اختلاف امتی رحمۃ'' (میری امت کا اختلاف رحمت ہے) صحاح' سنن' مسانید' موطات' مصنفات' معاجم غرض دنیا کی کسی کتابِ حدیث میں یہ حدیث موجود نہیں لیکن اسے خوب اچھالا گیا ہے جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اختلافات باقی رہیں اور پارٹی لیڈر شپ پر زد نہ آئے۔ اگر گروہی جھگڑے بالکل ختم ہو جائیں تو بہت سے لوگوں کی سیادت و قیادت بلکہ ان کا وہ مصرف ہی ختم ہو جاتا ہے جس سے ان کا مفادِ عاجل وابستہ ہے یہ جھوٹی اور جعلی روایت (اختلاف امتی رحمۃ) کچھ اس انداز سے پیش کی جاتی ہے کہ گویا اتحادِ امت رحمت نہیں ہے۔ صرف اختلافِ امت ہی سراپا رحمت ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ رمضان اور عید الفطر میں بھی یہ حضرات رویتِ ہلال کی صحیح تاریخ نہیں معین کر پاتے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہر روز کی اس بیکار کی الجھن کو بالکل ختم کر دیا جائے اور اس کی صرف ایک شکل ہے اور وہ یہ ہے کہ فلکی حساب پر اعتماد کر کے اعلان کر دیا جائے کہ فلاں دن سے فلاں مہینہ شروع ہوگا ہمارے علمائے کرام کو فلکیات کے علم پر غالباً کوئی اعتماد نہیں کیونکہ حدیث شریف میں صرف اتنا آیا ہے کہ صوموا لرویۃ وافطروا لرویۃ۔ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرو۔

ایک امی اور سادہ ترین تمدن رکھنے والی امت کو اس سے زیادہ اور کیا بتایا جا سکتا تھا؟ جو امت لکھنا پڑھنا بھی نہ جانتی ہو اس کے لئے بجز ''رُویت'' کے اور کیا طریقہ تجویز فرما سکتے تھے۔ وہاں فلکی تقویم کے وہ اکتشافات موجود نہ تھے۔ نیز اس وقت رویت کا بدل صرف ایسی عینی شہادتیں ہو سکتی تھیں جو قرب و جوار سے حاصل ہو جائیں اور اس قرب و جوار کی مسافت اتنی مختصر و محدود ہو کہ ایک انسان۔۔۔ پیدل یا سوار۔۔۔ آسانی سے چند گھنٹوں میں خبر لے کر آ جائے۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔ رسل و رسائل کا یہ حال ہے کہ ہزاروں میل سے چوتھائی سیکنڈ میں خبریں آ جاتی ہیں۔ مسافت اتنی سکڑ گئی ہے کہ مہینوں کا راستہ

گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ فلکی علوم اور تقویمات کا یہ عالم ہے کہ اب وثوق کے ساتھ معلوم ہے کہ:

(۱) ۲۹ دن، ۱۲ گھنٹے، ۴۴ منٹ اور ۱۷ اعشاریہ ۸۷ سیکنڈ میں چاند اپنی گردش پوری کر لیتا ہے۔

(۲) ۳۶۵ دن ۶ گھنٹے ۹ منٹ اور ۹۔اعشاریہ ۵ سیکنڈ میں زمین اپنی مداری گردش پوری کر لیتی ہے۔

اور آج پورے وثوق کے ساتھ مہینوں پہلے یہ پیشگوئی کر دی جاتی ہے کہ

(۳) اتنے بج کر اتنے منٹ اور اتنے سیکنڈ پر فلاں جگہ چاند گرہن یا سورج گرہن لگنا شروع ہو گا۔ اور چاند یا سورج کے اتنے حصے پر گہن لگے گا اور پھر کم ہونا شروع ہو گا۔ اور اتنی دیر تک فلاں جگہ اور اتنی مدت تک فلاں جگہ گہن قائم رہے گا۔

اس موقع پر ہماری طرف سے کچھ سننے کے بجائے صبحی محمصانی کی زبان سے سنئے وہ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہ امعلول یدور مع علتہ وجودا وعدما (معلول اپنی علت کے ساتھ موجود و معدوم ہوتا ہے) لکھتے ہیں کہ:

(عربی سے ترجمہ) ''اور اسی قاعدے کی بنیاد پر بعض فقہاء نے فلکی حساب سے اسلامی مہینوں خصوصاً رمضان کے ہلال کی تعیین کو جائز قرار دیا ہے اور اس کی تشریح یوں کی ہے کہ وہ حدیث جس میں روزے کے متعلق صرف رویت ہلال پر اعتماد کرنے کا حکم ہے ایک منصوص علت کے ساتھ وابستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ (مخاطب) امت امی واقع ہوئی تھی جو لکھنا اور حساب کتاب کرنا نہیں جانتی تھی۔ لہٰذا جب یہ امت اُمِیَّت سے نکل کر لکھنے پڑھنے اور حساب و کتاب کے لائق ہو گئی اور لوگوں کے لئے ہلال کے حساب میں یقین اور قطعیت تک پہنچنے کا امکان و سامان پیدا ہو گیا تو اس عمومی صورت حال کے ہوتے ہوئے اور اُمِیَّت کی علت ختم ہونے کے بعد اب یہی ضروری ہے کہ لوگ اس (حسابی) قطعیت و یقین کی طرف رجوع کریں۔ اور ہلال کو معلوم کرنے کے لئے تنہا (فلکی) حساب و کتاب کا طریقہ اختیار کریں اور رویت کے (سابق طریقے) کی طرف وہیں رجوع کریں جہاں فلکیات کا جاننا دشوار ہو۔''

محمصانی نے یہ پوری عبارت اپنی مشہورِ عالم کتاب ''فلسفتہ التشریع'' میں احمد شاکر کی کتاب ''اوائل الشہور العربیہ'' سے نقل کی ہے جو اسی مضمون پر لکھی گئی ہے کہ اب ہلال کے معاملہ میں فلکی حساب پر بلا تامل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس عبارت سے جو نکات معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ:

(۱) معلول ہمیشہ اپنی علت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

(۲) ہلال دیکھ کر صوم و افطار کا حکم اس امت کے لئے ہے جو اُمی ہو۔ اور فلکیات سے واقف نہ ہو۔ نہ خبریں پہنچائی جا سکتی ہوں، نہ اخبار وغیرہ پہنچتے ہوں۔

(۳) لیکن جہاں یہ مجبوریاں نہ ہوں وہاں بلا تامل فلکی علم کے مطابق تعیین ہلال کی جا سکتی ہے اور اسی کے مطابق

اسلامی تقریبات ادا کی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ذرا یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ آج پوری امت کس طرح اپنے بعض خالص دینی معاملات میں حساب و کتاب ہی پر اعتماد کر رہی ہے اور یہ اعتماد بالکل قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً

(۱) آج کوئی بھی سحری کے وقت اٹھ کر سیاہ اور سفید دھاری کے امتیاز کو نہیں دیکھتا۔ فلکی حساب ہی کے مطابق سائرن بجتا ہے یا گولا چھوٹتا ہے اور لوگ اس پر اعتماد کرتے ہیں۔

(۲) بلکہ افطار کے وقت بھی غروب آفتاب کی رویت کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی اور فلکی ریاضیات ہی پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

(۳) اب ایک نمازی بھی سایہ ناپ کر یا اپنی آنکھوں سے شفق وغیرہ کو دیکھ کر نمازیں نہیں پڑھتا بلکہ فلکی حساب کے مطابق جو اوقات نامے مسجدوں میں آویزاں ہوتے ہیں ان ہی پر اعتماد کر کے ساری نمازیں ادا کر لی جاتی ہیں۔

غرض کئی جگہ دینی معاملے میں فلکیات پر اعتماد کیا جاتا ہے تو ہلالِ رمضان وعید میں بھی فلکیات پر اعتماد کر لیا جائے تو کون سی قیامت آ جائے گی؟ قرآن کی رُو سے تو قمری اور شمسی دونوں طریقوں سے کیلنڈر مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اگر ملت کے اجتماعی مصالح کا تقاضا یہ ہو کہ شمسی مہینوں کے مطابق حساب رکھنا زیادہ منفعت بخش ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں؛ اگر کبھی اسلامی نظام قائم ہوا اور اس نے ایسا فیصلہ کر لیا تو پھر رویتِ ہلال کی اہمیت ہی نہیں رہے گی۔ نوع انسانی سمٹ کر ایک برادری بنتی جا رہی ہے۔ جب یہ برادری ایک خدا کے ایک قانون (قرآن) کے تابع آ جائے گی تو پھر حساب کتاب بھی اسی طرح رکھا جائے گا جس سے ان کی وحدت مستحکم ہوتی چلی جائے۔

ضرورت رشتہ

قبول سیرت وصورت، رنگ گندمی، قد 5 فٹ 8 انچ، عمر 32 سال، سول سروس (حکومتِ پنجاب) میں عرصہ 10 سال سے ملازمت، ایم۔اے۔انگلش، قرآنی فکر سے کشید شدہ شخصیت کے حامل انسان، کو بلا رنگ ونسل، بلاتفریق ذات پات برادری، بلافرقہ بازی کے، ہم مزاج، ہم سوچ وقرآنی فکر والی لڑکی کا رشتہ درکار ہے جو قوانینِ قرآن کے تحت میرے ساتھ عملی طور پر قدم بہ قدم تاحیات ساتھ دے کر عظیم مقصد حیات کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکے۔ خواہش مند حضرات رابطہ فرمائیں۔

برائے رابطہ موبائل: +923349737667، Email:mymeem@gmail.com

☆☆☆☆☆☆☆☆

متوازن شخصیت، صحت مند، قرآنی تصور حیات سے ہم آہنگ، عمر 44 سال، عقدِ ثانی کے لئے عمر 30 سے 40 سال کے درمیان سماجی حیثیت سے قطع نظر صرف قرآنی فکر سے متفق (طاہرہ) کا رشتہ درکار ہے۔ والدین، سرپرست یا خود مختار رابطہ کریں۔

موبائل: 0345-5146341، Email:anverejaz@yahoo.com

عید کا چاند

ثمینہ بلال

عید کے چاند تم کو آنا ہو تو
میری چھت پہ قیام مت کرنا
بارشوں میں یہ چھت ٹپکتی ہے
بادلوں میں مقام مت کرنا
میرے گھر میں جو شام ہوتی ہے
مفلسی پیٹ بھر کے سوتی ہے
میرے بچے جو بھوکے سوتے ہیں
اُن کی ماں ہچکیوں میں روتی ہے
عید کے چاند مجھ کو تو ہی بتا
نئے کپڑے کہاں سے لاؤں میں
چوڑیاں مہنگی ہو گئیں وہ بھی
اپنی بیٹی کو کیا دلاؤں میں
عید کے چاند تم سے کیسے کہوں
میرے بچے نے مجھ سے مانگا ہے
نئے کپڑے نبی ﷺ کی سنت ہیں
اس نے جوڑا پرانا مانگا ہے
ان کو تعلیم کیسے تحفہ دوں
میں جنہیں بھوک روز دیتا ہوں
قرض مانگا تھا جو بُرے دن سے
اس پہ میں سود روز دیتا ہوں
عید کے چاند کیا خبر ہے تمہیں
کتنی آنکھوں کو خوں رُلاتا ہے
کتنے ہی خواب ٹوٹ جاتے ہیں
تو جو نینوں میں جھلملاتا ہے
کتنی ماؤں کی کوکھ جلتی ہے
تو فلک پہ جو جلنے آتا ہے
کتنے ہی باپ منہ چھپاتے ہیں
تو جو پردے سے مکھ دکھاتا ہے
کتنے مفلس ہی ہاتھ ملتے ہیں
جب کوئی عید ملنے آتا ہے
تو سارے بچوں کا چندا ماموں ہے
آدھے بچوں کو کیوں رُلاتا ہے
عید کے چاند التجا ہی سمجھ
کسی بددل کی بددعا ہی سمجھ
اس برس میرے گھر میں مت آنا
اس برس مفلسی کے ڈیرے ہیں
اور اگلے برس جو بچوں کو
عید کی میں خوشی نہ دے پایا
تو مجھے اپنے ساتھ لے جانا
میرے بچوں کو خواب دے جانا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرتبہ بزم لندن

ہم عید کیوں مناتے ہیں؟

عیدالفطر: دنیا کی ہر قوم کوئی نہ کوئی تہوار مناتی ہے۔ ہم بھی سال کے مختلف دنوں میں بعض تیوہار مناتے ہیں لیکن اس عید کا تہوار وہ ہے جسے بطور جشن مسرت منانے کا حکم خود خدا نے دیا ہے۔ اس سے اس تیوہار کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سورہ یونس میں ہے:

''اے نوع انسان تمہارے رب کی جانب سے ایک ضابطہ قوانین نازل ہوا ہے جو انسان کی تمام نفسیاتی بیماریوں کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے اور ان کے لئے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھیں سامان پرورش اور منزل انسانیت تک پہنچنے کی راہنمائی ہے۔'' (10/57)-

اس کے بعد فرمایا:

''اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے ہے کہ ایسا بے مثال ضابطہ زندگی مل گیا ہے تم کیا اگر ساری دنیا کے انسان بھی مل کر کوشش کرتے تو اس جیسا ضابطہ نہ مل سکتا' لہٰذا تمہیں چاہئے کہ ایسی قیمتی چیز کے اس طرح مفت مل جانے پر جشن مسرت مناؤ۔ وہ دولت کہ انسان جو کچھ بھی جمع کرے یہ اس سے زیادہ قیمتی ہے۔'' (10/58)-

یہ ہے وہ تقریب جسے بطور جشن منانے کی تاکید خدا نے کی ہے یعنی جشن نزول قرآن اور نزول قرآن کی ابتداء چونکہ رمضان کے مہینے میں ہوئی تھی (2/185) اس لئے رمضان کا پورا مہینہ گویا اس جشن کی تیاریوں کے لئے تھا اور عیدالفطر اس جشن کی تکمیل کا دن۔ پورے تیس دن کے روزے تیاری میں۔ یہاں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالآخر ہمیں دیا کیا ہے جس کے لئے ہم سے جشن مسرت منانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس سوال کا جواب قرآن یہ دیتا ہے کہ وہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کہا ہے کہ۔۔۔ اے رسول! ہم نے یہ کتاب تیری طرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو اس شمع نورانی کے ذریعے نوع انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے (10/57-58)۔ ذرا سوچئے کہ تاریکی میں کیا ہوتا ہے اور روشنی اس کی جگہ کیا کرتی ہے؟ تاریکی میں کسی شے کا مقام متعین نہیں ہوتا۔ روشنی میں ہر شے اپنی صحیح حقیقت کے ساتھ اپنے مقام پر نظر آجاتی ہے۔ یہ تاریکی ہی ہے جس میں ہم رسی کو سانپ اور

سانپ۔کوبعض اوقات رسی سمجھ لیتے ہیں۔روشنی آجانے سے رسی رسی اورسانپ سانپ کی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔

نزول قرآن سے قبل تاریکیاں: نزول قرآن سے پہلے انسان پر اس قدر تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں کہ نہ وہ خارجی کائنات کی کسی شے کواس کی اصلی شکل میں دیکھ سکتا تھا نہ وہ اپنے مقام سے آگاہ تھا۔

یہ تاریکیاں کیا تھیں؟ دل و دماغ کی تاریکیاں' فکر و نظر کی تاریکیاں یعنی جہالت اور توہم پرستی کی تاریکیاں۔مختصراً یہ کہ اپنے مقام سے بیگانگی کی تاریکیاں اورحقیقت یہ ہے کہ تمام تاریکیوں کا منبع یہی تاریکی تھی باقی سب تاریکیاں اس کی پیداوار تھیں۔اگر انسان پر اس کا صحیح مقام روشن ہوجائے تو یہ تمام تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔لہٰذا سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے انسان کا صحیح مقام کیا بتایا ہے؟ اس سوال کی تفصیل میں جانا چاہیں تو اس کے لئے سارے کا سارا قرآن سامنے لانا پڑے گا جس کی اس مختصر تحریر میں گنجائش نہیں' لہٰذا اس کے صرف چند ایک گوشے ہی سامنے لائے جاسکتے ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ نزول قرآن سے پہلے انسان کن تاریکیوں میں ڈوبا ہوا اور کن پستیوں میں گرا ہوا تھا۔ نزول قرآن کے وقت انسان کی کیفیت یہ تھی کہ۔۔۔ انسان' انسان کی پرستش کرتا تھا۔غلامی کا جواء اس کی گردن میں پڑا ہوا تھا۔کہیں ملوکیت کا فولادی پنجہ اس کی رگ جان کو دبائے ہوئے تھا۔کہیں رہبانیت کی غیر فطری زندگی اس کے دل و دماغ کو بری طرح ناکارہ بنائے ہوئے تھی۔کہیں سرمایہ دار کی ہوس اس کے خون کا آخری قطرہ تک چوس رہی تھی۔یہ تھی انسان کی کیفیت۔

توہم پرستی: جب قرآن آیا اوراس نے اعلان کیا کہ خدا کے اس رسول ﷺ کے ظہور کا مقصد یہ ہے کہ یہ ان تمام زنجیروں کوتوڑ دے گا جن میں انسان جکڑا چلا آرہا ہے۔یہ اس کے سر سے ان بوجھل سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے بوجھ سے یہ کچلا جارہا ہے (7/157)- ان زنجیروں میں سب سے پہلی زنجیر اس کی توہم پرستی کی تھی جس کی رو سے یہ خارجی کائنات کی ہر قوت سے ڈرتا تھا۔بادل گرجا اور یہ سہم گیا۔بجلی کڑکی اور یہ دبک کر بیٹھ گیا۔پہاڑ سامنے آیا تو اس کی ہیبت سے لرز اٹھا۔ان قوتوں کے خطرات سے بچنے کے لئے اس کے ذہن میں ایک ہی طریق آسکتا تھا اور وہ یہ کہ ان قوتوں کو خدا تسلیم کرلیا جائے' ان کے سامنے جھکا جائے' ان کی پرستش کی جائے' ان کے حضور قربانیاں دے کر انہیں خوش کرنے کی کوشش کی جائے۔

مقام آدمیت: خارجی قوتوں کے مقابلہ میں یہ تھا وہ مقام جو انسان نے اپنے لئے تجویز کر رکھا تھا۔قرآن آیا اوراس نے کہا کہ تم ان سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ کیفیت یہ ہے کہ۔۔۔کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے خدا نے تمہارے فائدے کے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔(45/12-13, 31/20) اگر تم ذرا غور و فکر سے کام لو تو یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ ان کا

مقام کیا ہے اور تمہارا مقام کیا۔ یہ سب خادم ہیں اور انسان ان کا مخدوم۔ یہ سب قوانین خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں اور انسان کو ان قوانین کا علم دے دیا گیا ہے۔ جوں جوں تم ان قوانین کا علم حاصل کرتے جاؤ گے یہ قوتیں تمہارے سامنے جھکتی جائیں گی۔

سنت اللہ: یہ قوانین جن کے مطابق یہ بڑی بڑی قوتیں مصروف عمل ہیں' اٹل ہیں' نہ بدلنے والے قوانین ہیں۔ اس لئے تمہیں اس کا خدشہ نہیں ہونا چاہئے کہ نہ معلوم کس وقت یہ قانون بدل جائے اور یہ قوتیں میرے قابو سے نکل جائیں۔ یہاں پر ہر بات قانون کے مطابق ہوتی ہے' قانون کے مطابق ہوتی رہے گی اور ان قوانین میں کبھی بھی تبدیلی نہیں آئے گی (33/62)- یہ تھا وہ آئینہ جس میں قرآن نے انسان کو اس کی حقیقی شکل دکھائی تو وہ ایک ہی جست میں مسجود ملائک اور مخدوم کائنات بن گیا۔ انسان کے لئے مجبور محض اشیائے کائنات کو مسخر کر لینا پھر بھی آسان تھا' مشکل مرحلہ وہ تھا جہاں انسان دوسرے انسان کے ظلم کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ زنجیر انسانی حکمرانی کی تھی اور اس خوئے غلامی میں اسے اس قدر پختہ کر دیا گیا تھا کہ وہ انسانوں کی محکومیت کو اپنی فطرت کا تقاضہ اور ان کا پیدائشی حق سمجھنے لگ گیا تھا۔

حق حکومت: قرآن کریم آیا اور اس نے اعلان کیا کہ۔۔۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں' خواہ خدا نے اسے کتاب' حکومت حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ دی ہو' کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا سے ورے میری محکومی اختیار کرو۔ وہ تو یہی کہے گا کہ تم ربانی بنو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کتاب خداوندی کی اطاعت کرو جسے تم پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو (3/78-79)- آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کے اس اعلان نے انسان کو کس طرح ہر قسم کی انسانی غلامی سے نجات دلا کر اسے ایک خدا کی محکومیت کی دعوت دی۔ قرآن کریم کی ساری تعلیم اسی بنیادی نقطہ کی شرح ہے کہ۔۔۔ اطاعت صرف قوانین خداوندی کی کرو' ان کے علاوہ کسی انسان کی اطاعت مت کرو (12/40)- انسان کا تخلیقی مقصد یہ ہے کہ وہ صرف قوانین خداوندی کی محکومیت کرے اگر اس نے اس کے علاوہ کسی اور کی محکومی اختیار کی تو یہ اس کی تخلیق کے مقصد کے خلاف ہوگا۔ یہ تو تھا ملوکیت کا ظلم جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے سامنے جھکنے پر مجبور کرتا ہے لیکن یہ جھکنا انسان کے بدن کا تھا وہ چاہتا تو اپنے دل و دماغ کو اس سے آزاد رکھ سکتا تھا لیکن اس سے آگے انسان کے جھکنے کا وہ مقام آتا ہے جس میں اس کے دل و دماغ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

مذہبی پیشوائیت: یہ غلامی تھی مذہبی پیشوائیت کی جو دوسرے انسانوں سے اپنی خدائی منواتی تھی۔ قرآن کریم نے انسان کو آواز دی اور اس سے کہا کہ آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ یہ جو مقدس نقابوں کی اوٹ میں خدا کے نمائندے بن کر تمہارے سامنے آتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ پیران طریقت ہوں یا علمائے شریعت ان کا سارا مسئلہ معاشی ہے لیکن یہ اسے مذہب کے پردے میں چھپائے رکھتے

ہیں۔ ان میں اکثر کا یہ عالم ہے کہ خود کچھ نہیں کماتے اور دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے ہیں (9/34)۔ دعویٰ ان کا یہ ہے کہ یہ لوگوں کو خدا کی راہ بتاتے ہیں لیکن درحقیقت انہیں خدا کے راستے پر چلنے سے روکتے ہیں۔ یہ خدا سے ورے خود خدا بن بیٹھے ہیں۔ اس لئے خدا تک پہنچنے ہی نہیں دیتے' راستے میں ہی روک لیتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ اگر لوگ خدا تک پہنچ جائیں یعنی اس کی اس کتاب کو اپنا راہنما بنا لیں تو ان خدا کے نمائندوں کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ مذہبی پیشوائیت کی حکمرانی کا دائرہ زندہ انسانوں تک ہی محدود نہیں ہوتا ان کی حکومت ان کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے بلکہ مرنے کے بعد ان کی گرہیں اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہیں۔ زندہ انسان ان مردوں کی بے پناہ قوتوں کے خیال سے کانپتا ہے' ان کے حضور منتیں مانتا اور نذانے گزارتا ہے۔ جہاں تک مُردوں کی غلامی کا تعلق تھا قرآن نے زندہ انسانوں سے کہا کہ ذرا سوچو کہ جن ہستیوں کو تم اپنا ''خدا'' سمجھ رہے ہو ان کی حالت یہ ہے کہ۔۔۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سن نہیں سکتے اور اگر وہ بفرض محال تمہاری پکار سن بھی لیں تو اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ ان کی بے خبری کی یہ حالت ہے کہ ان مردوں کو خود اپنے متعلق بھی علم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے (46/4-5, 27/65)۔ لہٰذا ان سے ڈرنا کیوں اور ان سے مرادیں کیوں وابستہ کرنا (25/3)۔ یہ انسان کی انتہائی پستی ہے کہ وہ مُردوں سے ڈرتا رہے اور انہیں اپنا حاجت روا تسلیم کرے۔

منشورِ آزادی: انسان کو انسان کے آگے جھکانے کی ایک موثر تدبیر یہ تھی کہ اسے روٹی کا محتاج بنا دیا جائے اور اس طرح اسے بھوکا رکھ کر اس سے اپنا حکم منوا لیا جائے۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ رزق کے معاملے میں کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہے۔ ہم تمام افراد کے رزق کے ذمہ دار ہیں' ان کے بھی اور ان کی اولاد کے بھی۔ ہم ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کی ہدایت کرتے ہیں جس میں رزق کے سرچشمے انسانوں کی ملکیت میں رہنے کے بجائے تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ بنیں اور کوئی کسی کا محتاج و محکوم نہ ہو (17/31, 11/6, 6/152)۔ یہ تھے وہ تصورات جو قرآن نے دیئے اور اس طرح انسانوں کو ان کے صحیح مقام سے آگاہ کیا (17/70) اور ان سے کہہ دیا کہ اگر تم قرآنی قوانین پر کاربند ہو گے تو تمہیں ایک ایسا معاشرہ میسر آ جائے گا جس میں کیفیت یہ ہو گی کہ تمہیں نہ کسی قسم کا خطرہ ہو گا نہ خوف و حزن (10/62-64, 7/35, 2/37-38)۔ بلکہ ہر طرح کا اطمینان اور ہر طرح کی سلامتی میسر ہو گی۔

مساواتِ انسانی: اس میں ہر انسانی بچے کو زندگی کی دوڑ میں مقابلے کے لئے ایک جیسا میدان ملے گا۔ نہ کسی سے بے جا رعایت ہو گی نہ کسی کے راستے میں رکاوٹ آئے گی۔ جس کا جی چاہے اپنی محنت سے آگے بڑھ جائے' جس کا جی چاہے اپنی بے عملی سے پیچھے رہ جائے۔ یہاں ہر فیصلہ انسان کے جوہر ذاتی اور عمل مسلسل کے مطابق ہو گا (99/7-8)۔

(46/19) یہ نہ ہوگا کہ بڑے باپ کا بیٹا سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہو اور غریب کا بیٹا ابتدائی تعلیم تک بھی نہ حاصل کر سکے کیونکہ اس کے باپ کے پاس اسے سکول میں داخل کروانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ یہ پیدائشی تفریق برہمن کی خود ساختہ زنجیریں تھیں جن میں وہ شودر کو جکڑے رکھتا تھا۔ قرآن کریم نے انسان کو ان تمام زنجیروں سے آزاد کر دیا۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے نوع انسان کو قرآن دیا گیا اور اسے کہا گیا تھا کہ ایسے منشور حریت و آزادی کے عطا ہونے پر جشن مناؤ۔

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزمِ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	160/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	325/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	325/-
سورہ النحل	(16)	334	250/-	سورہ یٰسین	(36)	164	125/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	275/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	325/-
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	325/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	325/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	275/-				
سورۃ الانبیآء	(21)	336	225/-				
سورۃ الحج	(22)	380	275/-				
سورۃ المؤمنون	(23)	408	300/-				
سورۃ النور	(24)	264	200/-				
سورۃ الفرقان	(25)	389	275/-				
سورۃ الشعرآء	(26)	454	325/-				
سورۃ النمل	(27)	280	225/-				
سورہ القصص	(28)	334	250/-				
سورہ عنکبوت	(29)	388	275/-				

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) 25/B، گلبرگ 2، لاہور، فون نمبر: 4546 3571-42-92+

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جاوید چودھری

متحدہ اذان

ہمارے علمائے کرام کو بھی مصری علماء کی طرح اکٹھا ہونا چاہئے اور دنیا کو عصری تقاضوں سے ہمکنار کرنے کا سلسلہ شروع کر دینا چاہئے کیونکہ نائین الیون کے بعد اسلامی ممالک میں دینی طبقے کو ایک سازش کے تحت پچھلی صفوں میں دھکیلا جا رہا ہے اور اگر اس وقت علمائے کرام سامنے نہ آئے' انہوں نے جدید دور کے جدید آلات کو اپنی ڈھال نہ بنایا اور انہوں نے آج کے ذہن کو اپیل نہ کیا تو اسلام پسند آہستہ آہستہ اسلامی دنیا میں سمٹتے چلے جائیں گے اور ان کی جگہ ''روشن خیالی اور اعتدال پسندی'' لے لے گی۔ ہمیں ماننا پڑے گا اسلامی دنیا میں دینی طبقہ اجنبی ہوتا چلا جا رہا ہے جبکہ نام نہاد روشن خیال اور اعتدال پسند مغرب کی طاقت اور پیسے کے زور پر معاشرے پر حاوی ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کو اگر یقین نہ آئے تو آپ نائین الیون سے پہلے کے پاکستانی معاشرے اور نائین الیون کے بعد کے پاکستانی معاشرے کا تقابل کر لیں' آپ کو نو برسوں میں پاکستانی معاشرے میں بہت بڑی تبدیلی نظر آئے گی' ہم نو سال پہلے تک جس کو فحاشی' عریانی' مغربیت اور کفر سمجھتے تھے وہ آج روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے لیبل کے ساتھ نہ صرف ہمارے معاشرے کا حصہ بن چکی ہے بلکہ ہم اس پر فخر بھی کر رہے ہیں۔ اس تبدیلی کی بے شمار وجوہات ہیں جن میں سے ایک وجہ ہمارے علمائے کرام بھی ہیں' ہمارے علمائے کرام بدقسمتی سے آج کے آئی فون یا آئی پیڈ ذہن کو مطمئن نہیں کر پا رہے' یہ انٹرنیٹ اور نیوز چینلز کے دور کا مقابلہ نہیں کر پا رہے چنانچہ آج ہماری نئی نسل اسلام سے دُور اور مغرب کے قریب ہوتی جا رہی ہے اور یہ انتہائی خطرناک صورتحال ہے کیونکہ اس کی اگلی سٹیج ملک میں شراب خانوں' ڈسکوکلبز' قحبہ خانوں اور گرل فرینڈ' بوائے فرینڈ کا اوپن کلچر ہے اور یہ صورتحال جب ملک میں قانونی شکل اختیار کر لے گی اور دینی طبقے اس کے خلاف مزاحمت کریں گے تو بنیادی انسانی حقوق کا واویلا شروع ہو جائے گا اور اس سے صورتحال مزید گھمبیر ہو جائے گی' مسجد اور کلب دو الگ الگ یونٹ ہو جائیں گے' حکومت ان دونوں کے درمیان بیٹھ جائے گی اور یہ مسجد والوں سے کہے گی آپ اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کریں اور کلب میں مصروف لوگوں کو گارنٹی دے گی ملک کا کوئی شہری آپ کی پرائیویسی میں مداخلت نہیں کرے گا' آپ اطمینان سے اپنی شاموں کو رنگین بنائیں بس حکومت کو سترہ فیصد جی ایس ٹی دے دیا کریں' ہم اگر لبرل ازم کے اس اندھے انجام سے

بچنا چاہتے ہیں تو ہمارے علمائے کرام کو مصری علماء کی طرح میدان میں آنا ہوگا اور مذہب کو جدید اذہان کے لئے قابل قبول بنانا ہوگا۔ میں اب مصری علمائے کے اس اقدام کی طرف آتا ہوں جس نے مجھے یہ سطریں تحریر کرنے پر مجبور کیا۔

ہم سب بچپن سے دیکھ رہے ہیں ملک میں جب بھی اذان کا وقت ہوتا ہے تو تمام مساجد کے لاؤڈ سپیکر ایک کے بعد ایک ''آن'' ہو جاتے ہیں اور دس' پندرہ' بیس منٹ تک اذان کا سلسلہ چلتا رہتا ہے' ایک مسجد کی اذان ختم ہوتی ہے تو دوسری مسجد سے اذان شروع ہو جاتی ہے' وہاں ختم ہوتی ہے تو تیسری مسجد کا سپیکر آن ہو جاتا ہے' یہ تمام مساجد ایک دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہوتی ہیں چنانچہ اس ایک دو کلومیٹر میں بیٹھے شخص کی سرگرمیاں قریباً معطل ہو کر رہ جاتی ہیں' گفتگو کرنے والے خاموش ہو جاتے ہیں' خریداری کرنے والے خریداری بند کر دیتے ہیں اور پڑھائی کرنے والے پڑھائی روک دیتے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ یہ صورتحال مصر میں بھی تھی' قاہرہ شہر میں چار ہزار مساجد ہیں' وہاں دن میں پانچ بار اذانیں گونجتی ہیں اور اس وجہ سے شہر میں بعض اوقات ایسی صورتحال پیدا ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے نوجوان اپنے علمائے کرام کی طرف حیرت سے دیکھتے تھے' مصری علماء نے طویل غور و فکر کے بعد اس کا بڑا دلچسپ حل نکالا' انہوں نے قاہرہ میں ''متحدہ اذان'' کا فارمولا طے کر لیا' یہ فارمولا گیارہ اگست 2010ء رمضان کے پہلے دن سے قاہرہ شہر میں نافذ ہو جائے گا' اس دن شہر کی تمام مساجد سے لاؤڈ سپیکر اتار دیئے جائیں گے اور ایک ہی وقت میں ساری مسجدوں کے لئے اذان ہو گی' یہ ''متحدہ اذان'' ریڈیو سے بھی نشر ہو گی' علمائے کرام نے اذان سننے کے لئے خصوصی ریسیور تیار کروائے ہیں' یہ ریسیور ایک سو اسی مصری پاؤنڈز سے بازار سے خریدے جا سکتے ہیں' لوگ یہ ریسیور اپنے گھروں' دکانوں' گاڑیوں اور ٹیکسیوں میں لگا سکتے ہیں' یہ ریسیور اذان کے وقت خود بخود آن ہو جائیں گے اور ریڈیو سے نشر ہوتی ہوئی اذان کی آواز ریسیور کے مالکان تک پہنچ جائے گی' یہ اقدام اس سال صرف قاہرہ شہر تک محدود رہے گا جبکہ اگلے رمضان سے یہ سلسلہ دوسرے شہروں تک وسیع کر دیا جائے گا یوں تمام شہروں میں متحدہ اذان ہو گی جس سے نماز کے اوقات میں بھی ایک نظم و ضبط پیدا ہو جائے گا اور لاؤڈ سپیکر کے استعمال سے پیدا ہونے والے مسائل بھی ختم ہو جائیں گے' علمائے کرام کے اس ''اینی شیٹو'' کے دو بڑے فائدے ہوں گے' ایک دینی طبقے اور جدید ذہن کے درمیان فاصلہ کم ہو جائے گا اور آج کا ''آئی فون مائینڈ'' علمائے کرام کی ذہانت اور اتحاد سے متاثر ہو گا جس سے لبرل اور دینی طبقے کے درمیان موجود خلیج کم ہو گی۔ دو' مصری معاشرے میں یہ تاثر ابھرے گا کہ دینی طبقے میں بھی لچک موجود ہے' یہ لوگ بھی عام لوگوں کے مسائل کو سمجھتے ہیں اور یہ ان مسائل کو حل بھی کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے علمائے کرام بھی مصری علمائے کرام کی طرح اجتہاد کر سکتے ہیں' یہ بھی ایسے مسائل کا کوئی جدید حل

تجویز کر سکتے ہیں' ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا لاؤڈ سپیکر' عید کا چاند اور متنازعہ بیانات تین ایسی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے آج کا ذہن ہمارے دینی طبقے سے دور ہو رہا ہے' شہر کی مساجد میں ہائی پاور سپیکر کی وجہ سے شہری زندگی بہرحال متاثر ہوتی ہے' اس سے طالب علموں' بیماروں اور زندگی کے دوسرے تقاضوں میں مصروف لوگ متاثر ہوتے ہیں' ہماری مساجد میں بعض اوقات بیک وقت اذان کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس سے اذان کے الفاظ اور آوازیں ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو جاتی ہیں اور یہ صوتی اور تقدس دونوں لحاظ سے اچھی صورتحال نہیں۔ دوسرا' ایک کے بعد دوسری مسجد اور دوسری کے بعد تیسری مسجد سے اذان شروع ہو جاتی ہے چنانچہ لوگ اذان کے احترام میں کام کاج اور بات چیت چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ آج کے لوگ اس صورتحال پر بار بار علمائے کرام کی طرف دیکھتے ہیں اور ان سے پوچھتے ہیں ہم اگر ایک شہر میں ایک وقت میں ایک اذان پر متفق نہیں ہو سکتے تو ہم پورے اسلام پر کیسے متفق ہوں گے؟ دوسرا رمضان اور عید کے تعین پر ہم ہر سال پوری دنیا میں مذاق کا ہدف بنتے ہیں' ملک میں اکیسویں صدی میں تین تین عید ہوتی ہیں' لوگ اس مسئلے پر بھی علمائے کرام کی طرف دیکھتے ہیں اور پوچھتے ہیں جو عالم دین چاند کا فیصلہ نہیں کر سکتے وہ زندگی کے باقی معاملات میں ہماری کیا راہنمائی کریں گے اور تیسرا ہمارے علمائے کرام نے ایک دوسرے کو کافر قرار دینے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے آج کا ذہن اس پر بھی پریشان ہے' ہمارے نوجوان ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں ہم کس اسلام پر عمل کریں کیونکہ ہر دوسرے فرقے کا کوئی نہ کوئی عالم کسی نہ کسی شخص کو کافر قرار دے رہا ہے۔ ہمیں ماننا پڑے گا ہمارے علمائے کرام اعتراضات کو اختلافات اور اختلافات کو زندگی اور موت کا مسئلہ بنا رہے ہیں لہٰذا آج اس کا نتیجہ داتا دربار' امام بارگاہوں' مساجد اور قبرستانوں میں خودکش حملوں کی شکل میں نکل رہا ہے' ان خودکش حملوں سے جہاں انسانی جانوں کا نقصان ہو رہا ہے وہاں پوری دنیا میں اسلام بھی بدنام ہو رہا ہے۔ میں ہرگز عالم دین نہیں ہوں' اسلام کی تشریح اور اجتہاد کا فیصلہ بہرحال ہمارے علمائے کرام نے ہی کرنا ہے' یہ تعین کہ آیا پورے شہر یا ملک میں ایک وقت میں اذان دی جا سکتی ہے' پورے ملک میں ایک ہی دن رمضان اور عید کس طرح ممکن ہے اور ہم مختلف فرقوں کے درمیان نفرت کو کس طرح کنٹرول کر سکتے ہیں' یہ سارے فیصلے بھی ہمارے علمائے کرام نے ہی کرنے ہیں اور ان تبدیلیوں کی اسلام میں کس قدر گنجائش موجود ہے اس کا فیصلہ بھی علمائے کرام ہی کریں گے لیکن جہاں تک مصری علماء کا معاملہ ہے تو انہوں نے ''متحدہ اذان'' کا ''اینیشیٹو'' لے کر اجتہاد کے ایک دور کا آغاز کر دیا ہے چنانچہ اگر یہ جائز ہے اور اس سے اگر اسلام کی بنیادی ہیئت اور فلسفہ تبدیل نہیں ہوتا تو ہمارے علمائے کرام کو میدان میں آنا چاہئے' انہیں بھی ایسے ''اِنی شی اِٹیو'' لینے چاہئیں۔

(بشکریہ روزنامہ ایکسپریس لاہور' 9-7-2010)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بریگیڈیئر (ر) حامد سعید اختر

شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر مبارک کتنی تھی؟

(مضمون ہذا کی بہت زیادہ اہمیت کی وجہ سے اس کو روزنامہ نوائے وقت لاہور میں 16 جولائی 2010ء کے ملی ایڈیشن میں شائع کیا گیا اور روزنامہ پاکستان میں چار اقساط میں مورخہ 18-07-2010، 19-07-2010، 20-07-2010 اور 21-07-2010 کو ایڈیٹوریل صفحات پر شائع ہوا۔ لہٰذا اس مضمون کو جس میں علامہ حبیب الرحمٰن صدیقی اور غلام احمد پرویز کو عاشقانِ رسولؐ کی صف میں شمار کیا گیا ہے، ریکارڈ کے طور پر بشکریہ روزنامہ نوائے وقت لاہور اور روزنامہ پاکستان لاہور، ماہنامہ طلوع اسلام لاہور کی زینت بنایا جا رہا ہے۔)

سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 285 کے مطابق: ''تمام مومنین خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں اور (کہتے ہیں) کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔'' گویا دوسری اقوام پر بھیجے گئے پیغمبروں اور آسمانی کتب پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، تاہم مغربی اقوام اور مستشرقین آزادیٔ اظہار رائے کی آڑ میں اپنے پیغمبروں پر شرمناک اتہام تو لگاتے ہی ہیں، لیکن ان کا خاص ہدف پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد ﷺ ہیں۔ منافقت اور دوعملی کا مظاہرہ یوں ہوتا ہے کہ ایک جانب تو بین المذاہب ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے سیمیناروں کا انعقاد کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ گستاخانہ خاکوں اور تحریروں کے ذریعے براہ راست حضور اکرم ﷺ کی ذات پر رکیک حملے کئے جاتے ہیں، حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ مسلمان اس سلسلے میں انتہائی حساس ہیں اور حضور اکرم ﷺ سے بے پناہ عقیدت کے بغیر مسلمان کا ایمان ہی کامل نہیں ہوسکتا۔

اس دوغلے پن کے نتیجے میں مفاہمت اور موافقت کے بجائے مخاصمت، مناقشت اور عداوت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ماضی کی طرح اس بار بھی حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس کو گستاخانہ خاکوں کے ذریعے ہدف تنقید بنا کر مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کیا گیا ہے، لیکن یہ انتہائی افسوسناک امر ہے کہ پاکستان، بنگلہ دیش اور

اکا دکا دیگر ممالک کے سوا تمام مسلم ممالک پر سکوت مرگ طاری ہے اور مسلم امہ کی جانب سے کوئی جاندار اجتماعی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ ہماری اس بے حسی سے شہہ پا کر ناروے' ڈنمارک' ہالینڈ اور امریکہ نے دوسری بار یہ اسفل مشق دہرائی ہے' بلکہ اس بار ایک قدم مزید آگے بڑھ کر گستاخانہ خاکے بنانے کے مقابلے کا اہتمام کیا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ جو ملعون حضور اکرم ﷺ کی شان میں سب سے بڑھ کر بے ادبی کا مظاہرہ کرے گا' وہ انعام کا مستحق ٹھہرایا جائے گا۔ کمینگی کے مظاہرے کے لئے متعدد پہلوؤں سے حملہ کیا گیا ہے' جن میں پانچ موضوع سرفہرست ہیں:

1- قرآنی آیات کا غلط ترجمہ اور تشریح 2- جہاد سے متعلقہ آیات کو سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے غلط انداز میں پیش کرنا 3 - حجاب کو عورتوں کی آزادی Emancipation اور بنیادی انسانی حقوق کے خلاف قرار دینا 4- حضور اکرم ﷺ کے تعداد ازواج کے گھسے پٹے موضوع پر (مسکت جوابات کے باوجود) از سرنو ''عورتوں کے حقوق'' کے حوالے سے حضور اکرم ﷺ کی کردار کشی 5- ام المومنین سیدہ عائشہؓ کی ذات پر ناقابل برداشت اور ناقابل بیان رکیک الزامات۔

ان میں سے پہلے چار موضوعات پر تو عالم اسلام اور علمائے کرام کی جانب سے مدلل جواب دینے کا سلسلہ جاری ہے' لیکن موخر الذکر موضوع پر امت مسلمہ کی تحقیق نامکمل اور علمائے جمہور کی رائے منقسم ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ راقم' جب بھی ایک نوسالہ بچی کی شادی کا تصور ذہن میں لایا تو میری روح تک لرز اٹھی۔ ایسے مواقع پر میں نے ہمیشہ لاحول پڑھی اور اللہ سے دعا کی کہ اگر مبینہ واقعہ درست ہے تو اس کی مصلحت سے مجھے آگاہ فرما اور میرا ایمان مستحکم کر' لیکن اگر یہ روایت غلط ہے تو مجھے حقیقت تک پہنچنے کی توفیق عطا فرما۔ تحقیق کی وادیٔ پرخار میں قدم رکھنے کے بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ کئی عاشقانِ رسول ﷺ منزلیں مارتے ہوئے مجھ سے پہلے ہی بہت سا سفر طے کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں ''عمر عائشہؓ'' کے نام سے موسوم حکیم نیاز احمد اور علامہ حبیب الرحمٰن صدیقی کی کتب' ''سیرتِ عائشہؓ'' کے نام سے' حکیم فیض عالم صدیقی کی کتاب' غلام احمد پرویز کی کتاب ''طاہرہ کے نام'' میں حضرت عائشہؓ کی عمر کے حوالے سے تحقیقی مضمون اور ''عرب نیوز جدہ'' کی جانب سے شائع ہونے والی کتاب..... Our Dialogue..... جلد اول کے صفحات 72-70 پر ایک سوال کے جواب میں شائع ہونے والی تحریر خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ کتب میں بعض کا انداز عالمانہ کے بجائے قدرے مناظرانہ ہے اور کہیں کہیں طرز تحریر تیکھا ہو جاتا ہے' جو بعض شخصیات سے والہانہ عقیدت رکھنے والوں کو شاید شاق گزرے' تاہم اس سلسلے میں ضیاء القرآن پبلی کیشنز کی

جانب سے حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ''امہات المومنین اور مستشرقین'' ایک بہترین تحقیقی کتاب ہے' جس میں تاریخ کے حوالے سے تمام حقائق قاری کے سامنے پیش کر دیئے گئے ہیں اور اس احسن طریقے سے کہ انہیں مسترد کرنے کا کوئی جواز نہیں ملتا۔ مذکورہ بالا تمام کتب میں ناقابل تردید تاریخی حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ سے شادی کے وقت ام المومنین حضرت عائشہؓ کی عمر 17 سے 19 برس تھی' بلکہ ایک حوالے سے تو یہ 25 برس تک کی بھی ہوسکتی ہے۔ برسبیل تذکرہ ایران کے ڈاکٹر علی شریعتی نے بھی عائشہ صدیقہؓ کی عمر 13 سال اور بعض حوالوں سے 9 سال تحریر کی ہے۔

مزید آگے بڑھنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ ہم کچھ مستشرقین کی آراء سے بھی استفادہ کرلیں..... سر ولیم میور لکھتا ہے: ''حضور اکرم ﷺ سے شادی کے وقت عائشہؓ کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہ تھی''۔ میور نے دراصل قبل از ہجرت حضرت عائشہؓ سے حضور اکرم ﷺ کی نسبت کو شادی سمجھتے ہوئے تبصرہ کیا ہے۔ مذکورہ نسبت 10 نبوت میں ہجرت سے تین سال قبل طے پائی تھی' جبکہ رخصتی 2 ہجری میں جنگ بدر سے قبل ہوئی۔ تب تک نسبت طے ہوئے پانچ سال گزر چکے تھے' لہٰذا اس حساب سے رخصتی کے وقت ام المومنین عائشہؓ کی عمر 16 سال طے پاتی ہے۔

بی بی عائشہؓ کی ایک سخت نقاد نابیہ ایبٹ اپنی تصنیف Aisha Chicago Report-1940 کے صفحہ نمبر 1 پر تحریر کرتی ہے کہ ''ام المومنین عائشہؓ 614ء میں پہلی وحی کے نزول سے 5 سال قبل پیدا ہو چکی تھیں۔'' اس حساب سے رخصتی کی عمر 20 سال بنتی ہے' کیونکہ وحی کا نزول 610ء میں ہوا تھا نہ کہ 614ء میں۔ اب آیئے چند بنیادی حقائق کی جانب جو اس مسئلے کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوں گے:

1- اہل عرب ادب عالیہ اور شعر و شاعری کے علاوہ علم الانساب میں مہارت تامہ کے حامل تھے' لیکن جزیرہ نما عرب میں نہ تو کوئی کیلنڈر رائج تھا اور نہ ہی پیدائش و اموات کا ریکارڈ دستیاب تھا' بلکہ عمروں کا اندازہ اہم واقعات سے منسلک تھا۔ کسی عرب کے شجرۂ نسب کو دیکھئے تو بیسویں پشت تک کے حوالہ جات مل جاتے ہیں' مثلاً سیدہ عائشہؓ بنت ابوبکر صدیقؓ بن ابوقحافہ بن عامر بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ۔ یوں ساتویں پشت میں سیدہ عائشہؓ کا سلسلہ نسب حضور اکرم ﷺ سے مل جاتا ہے جو بیسویں پشت میں سعد بن عدنان تک جا پہنچتا ہے..... (بحوالہ رحمتہ للعالمینؐ جلد دوم' صفحہ 172)۔

2- اسی طرح سیدہ حفصہؓ کا آٹھویں پشت میں' سیدہ خدیجہؓ اور سیدہ ام حبیبہؓ کا پانچویں پشت میں' سیدہ ام سلمہؓ کا آٹھویں پشت میں' سیدہ سودہؓ کا نویں پشت میں' زینب بنت جحش کا پندرہویں پشت میں اور سیدہ میمونہؓ کا اٹھارہویں

پشت میں شجرۂ نسب حضور اکرم ﷺ سے مل جاتا ہے۔ تاہم عمروں کے معاملے میں بہت سے تاریخی اختلافات ہیں' جن کی وجہ قمری کیلنڈر کی عدم دستیابی ہے..... (بحوالہ رحمتہ للعالمینؐ جلد دوم' صفحہ 172)۔

3- حضور اکرم ﷺ کا سن پیدائش بھی ایک اہم واقعہ سے منسلک ہے' یعنی ''وہ سال'' جس میں ابرہہ ہاتھیوں کے ساتھ خانہ کعبہ پر حملہ آور ہوا (عام الفیل)..... اگر یہ واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو حضور اکرم ﷺ کے سن پیدائش کے تعین میں بھی مشکل پیش آتی۔ اسی طرح سیدہ فاطمہؓ اس سال پیدا ہوئیں' جب خانہ کعبہ کی قبل از نبوت تعمیر نو ہو رہی تھی (سن 5 قبل نبوت) جبکہ حضرت علیؓ اس سے پہلے پیدا ہو چکے تھے (قول عباسؓ۔ اسد الغابہ) تاہم ''کتنا پہلے'' کا تعین نہیں کیا گیا۔ غالباً پیدائش علیؓ کے وقت کوئی مزید اہم واقعہ رونما پذیر نہیں ہوا ہوگا' جس سے درست سال پیدائش کا تعین کیا جا سکتا۔ البتہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ خانہ کعبہ کی تعمیر پانچ سال قبل نبوت میں ہوئی۔ جب حضور اکرم ﷺ کی عمر 35 سال تھی اور آپ کی سیدہ خدیجہؓ سے شادی ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ اسی لئے مختلف محدثین اور مورخین قبول اسلام کے وقت حضرت علیؓ کی عمر آٹھ سے گیارہ سال بتاتے ہیں۔ اگر فاطمتہ الزہراؓ کی عمر سال بعثت میں پانچ سال تھی اور حضرت علیؓ ان سے تین چار سال بڑے تھے تو علیؓ کی عمر کا تعین قرین قیاس ہے۔ اس طرح حضرت علیؓ سے شادی کے وقت سیدہ فاطمہؓ کی عمر بیس اکیس سال طے پاتی ہے' لیکن عام رائے یہ ہے کہ ان کی شادی دس سال کی عمر میں ہوئی جو تاریخی حوالوں سے درست نہیں..... (اسد الغابہ' صفحہ 377)۔

4- اسی طرح جمہور کی رائے میں سیدہ خدیجتہ الکبریٰ کی حضور اکرم ﷺ سے شادی کے وقت عمر 40 سال بیان کی جاتی ہے' جبکہ وہ دو بار بیوہ ہو چکی تھیں' لیکن ابن عباسؓ ان کی حضور اکرم ﷺ سے شادی کے وقت عمر 30 / 28 سال بیان کرتے ہیں (بحوالہ زرقانی و مغلطانی)۔ نامور تاریخ دان ابن ہشام مختلف حوالوں سے سیدہ خدیجتہ الکبریٰ کی عمر 25 سے 35 سال تک بیان کرتے ہیں۔ یوں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ کیلنڈر کی عدم دستیابی کے باعث ان کبار اسلام کی عمروں کے تعین میں 12 سے 15 سال کا فرق معمولی بات ہے اور بعض غیر معتبر روایات کی وجہ سے دور رس نتائج رکھنے والی غلطیاں تاریخ کا حصہ بن گئی ہیں۔ بعض معاملات میں ابتدائی غلطیوں کا جواز فراہم کرنے کے لئے ضعیف روایات کا سہارا لے کر غلطیوں کو زیادہ سنگین بنا دیا گیا ہے۔ ام المومنین سیدہ عائشہؓ کی عمر کے تعین میں بھی یہی غلطی کی گئی ہے اور مستند تاریخی حوالوں کو نظر انداز کر کے بعض انتہائی ضعیف روایات کی بنیاد پر ان کی عمر شادی کے وقت 9 سال بیان کی گئی ہے۔ آج یہی غلطی حضور اکرم ﷺ کی ذات مقدس پر گھناؤنے

الزامات کا باعث بن رہی ہے۔

5- اس ضمن میں خود سیدہ عائشہؓ کی والدہ کی وفات کا واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔ ام رومان کنانیہ کی وفات رمضان 6 ہجری میں ہوئی تو نبی اکرم ﷺ خود ان کی قبر میں اترے تھے اور یہ فرمایا تھا کہ ''الٰہی تجھ سے پوشیدہ نہیں کہ ام رومان نے تیرے لئے اور تیرے رسول اکرم ﷺ کے لئے کیا کچھ برداشت کیا ہے۔'' نیز فرمایا: ''اگر کوئی شخص حورانِ جنت میں سے کسی عورت کو دیکھنا پسند کرتا ہو تو ام رومان کو دیکھ لے''..... (الاستیاب' صفحہ 792' رحمتہ للعالمینؐ جلد دوم' صفحہ 193)۔ تاہم امام بخاریؒ نے مسروق تابعی کی روایت سے ایک حدیث ام رومان سے منسوب کی ہے' جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ امام بخاریؒ کے نزدیک ام رومان کی وفات بعد از وفاتِ نبی اکرم ﷺ ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی غلطیاں لغزش بشری ہیں اور ان میں کسی بدنیتی کا عمل دخل نہیں' بلکہ تحقیق کی خامی ہے۔ بصورت دیگر ایسی روایات کے راوی ثقلِ سماعت اور ضعفِ ذکاوت کا شکار ہو چکے تھے۔

اب آیئے چند بنیادی حقائق کی جانب:

1- سیدہ خدیجتہ الکبریٰ سے حضور اکرم ﷺ کی شادی سن 15 قبل نبوت میں ہوئی اور 10 ہجری میں ان کی وفات تک صرف سیدہ خدیجہؓ ہی حضور اکرم ﷺ کے نکاح میں رہیں۔ یہ عرصہ پچیس سال بنتا ہے اور سیدہ خدیجہؓ کی وفات کے وقت حضور اکرم ﷺ کی عمر پچاس برس ہو چکی تھی۔ سیدہ خدیجہؓ کے بطن سے حضور اکرم ﷺ کے چھ بچے تولد ہوئے اور عام روایت کے مطابق ان کی عمر وفات کے وقت 65 برس تھی' جبکہ ان کی سب سے چھوٹی بچی بی بی فاطمہؓ صرف چودہ پندرہ برس کی تھیں۔ گویا سیدہ فاطمہؓ کی پیدائش کے وقت سیدہ خدیجہؓ کی عمر پچاس برس تھی جو سن یاس (Climacteric) کا عرصہ ہے۔ لہٰذا ابن عباسؓ اور ابن ہشام کی روایت درست دکھائی دیتی ہے کہ سیدہ خدیجہؓ کی عمر حضور اکرم ﷺ سے نکاح کے وقت 28 تا 30 سال اور وفات کے وقت 51/53 سال تھی۔ اسی طرح اگر فاطمتہ الزہراؓ کی عمر شادی کے وقت دس سال تسلیم کر لی جائے (جو کہ عام روایت ہے) تو فاطمہؓ اپنی والدہ کی وفات کے وقت صرف پانچ برس کی تھیں' گویا ان کی ولادت کے وقت سیدہ خدیجہؓ کی عمر 60 سال تھی؟ لہٰذا تاریخی اور طبی حقائق کے پیش نظر ابن عباسؓ اور ابن ہشام کی روایت قرین قیاس ہے کہ فاطمہؓ پانچ برس قبل نبوت پیدا ہوئیں' جب کعبہ کی تعمیر نو ہو رہی تھی اور اس وقت سیدہ خدیجہؓ کی عمر 38/40 سال اور حضور اکرم ﷺ کی عمر 35 سال تھی۔ اس حساب سے حضرت علیؓ سے شادی کے وقت سیدہ فاطمہؓ کی عمر 20/21 سال اور حضرت علیؓ کی عمر تقریباً 24 سال طے پاتی ہے' کیونکہ وہ سیدہ فاطمہؓ سے ''کچھ عرصہ'' قبل پیدا ہو چکے تھے اور قبول اسلام کے وقت سن ایک نبوی

میں ان کی عمر 8/11 سال تھی۔

2- سیدہ عائشہ صدیقہؓ سیدہ فاطمہؓ سے کچھ چھوٹی تھیں۔ سب سے معتبر سیرت نگار ابن اسحاق نے اولین اسلام قبول کرنے والے پچاس افراد میں حضرت عائشہؓ کا شمار بیسویں نمبر پر کیا ہے۔ اس فہرست میں دیگر کسی نومسلم بچے کا نام شامل نہیں' البتہ سیدہ عائشہؓ کے نام کے سامنے مرقوم ہے کہ وہ قبول اسلام کے وقت کم عمر تھیں۔ اگر حضرت علیؓ کی عمر دس گیارہ سال اور سیدہ فاطمہؓ کی عمر سات آٹھ سال تھی تو سیدہ عائشہؓ کی کم سے کم عمر بھی چھ سات سال تصور کی جاسکتی ہے۔ گویا ان کی پیدائش قبل از نبوت ہی ہو چکی تھی اور وہ قبول اسلام کے وقت سمجھ بوجھ رکھتی تھیں' ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ باقی نومسلم بچوں کے نام شامل نہ کئے جاتے۔ عسقلانی اور زرقانی بھی سیدہ عائشہؓ کو السابقون الاولون میں شمار کرتے ہیں۔

3- سن 10 نبوی میں سیدہ خدیجہؓ کی وفات کے وقت حضور اکرم ﷺ کی عمر پچاس سال تھی۔ حضرت عثمانؓ بن مظعونؓ کی بیوی اور مشہور صحابیہ سیدہ خولہؓ بنت حکیم نے حضور اکرم ﷺ کو اکثر غمگین اور افسردہ پایا تو انہیں عقد ثانی کا مشورہ دیتے ہوئے بی بی عائشہ (باکرہ) اور بی بی سودہؓ (بیوہ) کے نام تجویز کئے۔ حضور اکرم ﷺ کی اجازت سے حضرت خولہؓ نے دونوں جگہ پیغام دے دیا۔ حضرت ابوبکرؓ دو وجوہات کی بنا پر متردد تھے۔ ان کے خیال میں قرابت داری کے لحاظ سے سیدہ عائشہؓ حضور اکرم ﷺ کی بھتیجی تھیں اور ثانیاً ان کی نسبت جبیر بن مطعم بن عدی سے طے پا چکی تھی اور صرف رخصتی باقی تھی۔ حضور اکرم ﷺ نے وضاحت کر دی کہ دینی بھائی کی بیٹی سے نکاح جائز ہے تو حضرت ابوبکرؓ نے مطعم بن عدی سے عائشہؓ کی رخصتی کے متعلق استفسار کیا۔ مطعم کی بیوی نے جواب دیا کہ چونکہ عائشہؓ مسلمان ہو چکی ہے' لہٰذا ہمیں خدشہ ہے کہ وہ ہمارے بیٹے کو بھی ''لادین'' نہ بنا دیں۔ مطعم نے بھی بیوی کی رائے پر صاد کیا تو یہ نسبت ٹوٹ گئی اور حضرت اکرم ﷺ سے نسبت طے پا گئی۔ اگر سیدہ عائشہؓ کی پیدائش سے متعلق ''پانچ سال بعد نبوت'' کی مبینہ روایت درست مان لی جائے تو اس وقت سیدہ عائشہؓ کی عمر پانچ سال تھی۔ کیا حضرت ابوبکرؓ اپنی پانچ سالہ بیٹی کی رخصتی پر اصرار کر رہے تھے؟ واضح رہے کہ یہ واقعہ سن دس نبوت کا ہے۔

4- کیا نکاح ثانی سے حضور اکرم ﷺ اپنی دلجوئی اور رفاقت چاہتے تھے یا وہ (اس روایت کی رو سے) سیدہ فاطمہؓ سے بھی دس سال چھوٹی بچی سے نکاح کر کے اپنی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ کرنا چاہتے تھے؟

5- جزیرۃ العرب میں کم سنی میں لڑکیوں کی شادی کا رواج ہرگز نہیں تھا۔ شادی کی اوسط عمر 15 سال سے پچیس سال تھی۔ خود حضور اکرم ﷺ کی بیٹیاں فاطمۃ الزہراؓ 21 سال کی عمر میں اور ام کلثوم 18 سال کی عمر میں بیاہی گئیں۔

بی بی زینبؓ بنت جحش (حضور اکرم ﷺ کی پھوپھی زاد بہن) کی شادی زید بن حارثؓ سے 34 سال کی عمر میں ہوئی۔ سیدہ عائشہؓ کی بڑی بہن اسماءؓ کی شادی 25/26 سال کی عمر میں ہوئی..... (تہذیب التہذیب' جلد دوم' صفحہ 47)۔

6- حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے زمانہ جاہلیت میں قتیلہ بنت عبدالعزیٰ سے شادی کی جن کے بطن سے عبداللہ اور اسماءؓ پیدا ہوئے اور قبل از اسلام کے زمانے میں ہی رومان بنت عامر سے شادی کی' جن کے بطن سے حضرت عبدالرحمٰن اور سیدہ عائشہؓ کی ولادت ہوئی۔ گویا سیدہ عائشہؓ قبل از نبوت پیدا ہو چکی تھیں..... (ابوبکرؓ کی ازواج۔ تاریخ طبری)..... لہٰذا نبوت کے پانچ سال بعد بی بی عائشہؓ کی پیدائش کی روایت قطعاً غیر معتبر ہے۔

7- اگر پہلے یا دوسرے سال نبوت میں قبول اسلام کے وقت سیدہ عائشہؓ کی عمر چھ سات سال تھی تو ہجرت کے وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس سال طے پاتی ہے اور سن 2 ہجری میں رخصتی کے وقت انیس بیس سال قرار پاتی ہے۔

8- بعض روایتوں کے مطابق سیدہ عائشہؓ نے جنگ بدر میں بھی شرکت فرمائی' جبکہ پندرہ سال سے کم عمر کسی فرد کو حضور اکرم ﷺ نے جنگ کی اجازت نہیں دی تھی' لہٰذا ان کی عمر یقیناً پندرہ سال سے زائد تھی۔ حضرت عمرؓ نے جب بدری اصحابؓ کے لئے خصوصی وظیفہ مقرر کیا تو سیدہ عائشہؓ کو بھی دیگر اصحابؓ سے زائد وظیفہ ملتا رہا۔

9- سیرۃ النبیؐ کامل مرتبہ ابن ہشام میں بھی سیدہ عائشہؓ کا نام السابقون الاولون میں شامل ہے' یعنی وہ بابرکت شخصیات جو سب سے پہلے ایمان لائیں۔ اگر سن پانچ نبوی تک سیدہ عائشہؓ پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں تو ان کا اسم گرامی اس فہرست میں کیسے شامل کر لیا گیا؟

10- کتاب ''حیات سید العرب'' میں بھی سیدہ عائشہؓ کا نام السابقون الاولون میں شامل ہے' جس کی تائید حافظ بلقینی اور حافظ عراقی نے کی ہے۔ گویا پہلے سالِ نبوت میں سیدہ عائشہؓ کی عمر پانچ چھ سال تھی اور وہ سیدہ فاطمہؓ کی تقریباً ہم عمر تھیں۔ محدث سہیلی نے بھی اپنی کتاب ''الروض الالف'' میں عائشہ صدیقہؓ کو السابقون الاولون میں شامل کیا ہے۔

11- سیدہ اسماءؓ' سیدہ عائشہؓ کی علاتی بہن تھیں۔ شیخ ولی الدین خطیب اپنی کتاب ''الاکمالِ فی اسماء بال الرجال'' میں تحریر فرماتے ہیں..... حضرت اسماءؓ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی والدہ ہیں۔ مکہ میں ابتداء میں اسلام لائیں۔ وہ اپنی چھوٹی بہن عائشہؓ سے دس سال بڑی تھیں۔ اپنے بیٹے کے قتل کے دس دن بعد وفات پائی۔ ان کی عمر سو سال ہوئی اور یہ واقعہ 73ھ میں مکہ میں پیش آیا..... (مشکوٰۃ 556)۔

تمام مؤرخین حضرت اسماءؓ کے سن وفات اور سو

سالہ عمر پر بلا استثناء متفق ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کی سگی پھوپھی بی بی صفیہؓ بنت عبدالمطلب' سیدہ خدیجہؓ کے سگے بھائی عوام سے بیاہی گئیں۔ ان کے بیٹے کا نام زبیرؓ بن عوام تھا جو حضرت خدیجہؓ کے سگے بھتیجے' حضور اکرم ﷺ کے سگے پھوپھی زاد بھائی اور مشہور صحابی تھے۔ حضرت اسماءؓ کی شادی 26 سال کی عمر میں حضرت زبیرؓ بن عوام سے ہوئی۔ ہجرت کے موقع پر ان کی عمر 27 سال تھی اور وہ حاملہ تھیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ ہجرت کے پہلے سال مدینہ میں پیدا ہوئے تو مہاجرین اور انصار نے مشترکہ طور پر یہ پہلی خوشی منائی۔ ان کے ہاں دوسرے بیٹے عروہ کی پیدائش تقریباً بیس برس بعد ہوئی۔ عبداللہ بن زبیرؓ نے عبدالملک بن مروان کے خلاف بغاوت کر کے حجاز کے گردونواح اور عراق میں نو برس تک اپنی حکومت قائم رکھی۔ 73ھ میں حجاج بن یوسف نے انہیں شکست دے کر سولی پر چڑھا دیا۔ عروہ اپنے بھائی کا حشر دیکھ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ علمی کاموں تک محدود رہے اور دیر تک جئے۔

12- حضرت اسماءؓ 73ھ میں 100 سال کی تھیں' لہٰذا 73 سال قبل ہجرت کے وقت ان کی 27 سال عمر کی تصدیق ہو جاتی ہے' چونکہ حضرت عائشہؓ ان سے دس سال چھوٹی تھیں' لہٰذا ہجرت کے وقت ان کی عمر 17' 2 ہجری میں شادی کے وقت 19 سال اور دس ہجری میں حضور اکرم ﷺ کی وفات کے وقت 27 سال طے پاتی ہے۔

13- امام بخاریؒ نے کتاب التفسیر میں حضرت عائشہؓ سے یہ حدیث بیان کی ہے: ''جب مکہ میں یہ آیت نازل ہوئی (بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهَى وَاَمَرُّ) تو میں اس وقت ایک لڑکی تھی اور کھیلتی پھرتی تھی''..... (صحیح بخاری' مطبوعہ الطاف اینڈ سنز' جز دوم' صفحہ 1372' روایت نمبر 3876)۔

سورۂ قمر سن 4/5 نبویؐ میں نازل ہوئی تھی' اگر اس وقت سیدہ عائشہؓ کی عمر اتنی تھی کہ انہیں سورۂ قمر کی ایک آیت بھی یاد ہو گئی تو پھر ان کی پیدائش نبوت کے پانچ سال بعد کیسے درست قرار پا سکتی ہے' جبکہ ہشام بن عروہ متعدد روایات سے یہی غلط نتیجہ اخذ کرتا دکھائی دیتا ہے؟

14- یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ حضرت اسماءؓ کی تابعین کے دور میں عمر کے متعلق ایسی کوئی روایت منظر عام پر نہیں آئی' لیکن اچانک 185ھ میں ہشام بن عروہ کا شاگرد علی بن مسہر اپنے استاد کے حوالے سے متعدد احادیث منظر عام پر لے آتا ہے' جن کے ذریعے نہ صرف سیدہ عائشہؓ کو شادی کے وقت نابالغ ثابت کیا جاتا ہے' بلکہ ان سے منسوب کر کے بڑی بے تکلفی سے ''خلوتِ صحیحہ'' بھی عائشہ صدیقہؓ کی زبانی بعمر نو سال بیان کی جاتی ہے۔ اول تو زن وشوہر کے تعلقات کا بے تکلفانہ بیان ہی طبیعت پر شاق گزرتا ہے اور یہ امر پیغمبر ﷺ کی محبوب بیوی کی زبانی بیان ہونا' ان کی متانت اور وقار کے منافی دکھائی

دیتا ہے۔ دوم اس سلسلے کی تمام احادیث کا راوی ہشام بن عروہ ہے اور تمام احادیث کا آخری ماخذ ایک مرد راوی عروہ بن زبیر ہے' جو حضرت عائشہؓ کی بہن اسماءؓ کا بیٹا' یعنی بی بی عائشہؓ کا بھانجا اور عمر میں ان سے چالیس سال چھوٹا تھا' کیا ام المومنینؓ نے معاذ اللہ اپنی خانگی اور قطعی ذاتی زندگی کے واقعات اپنے بھانجے کے سامنے بیان کئے تھے؟ ایسا خیال ہی سراسر لغو اور نا قابل قبول ہے۔ ایسی احادیث کا ہشام بن عروہ کے علاوہ ایک بھی مزید راوی نہیں تھا' لیکن ہشام کے عراق پہنچتے ہی گیارہ راوی پیدا ہو گئے اور یہ عجوبہ روایت صحاح میں جگہ پا کر پوری امت میں پھیل گئی۔

15- ہشام بن عروہ بی بی اسماءؓ کا پوتا تھا اور اول اول بہت معتبر راوی سمجھا جاتا تھا۔ وہ 71 برس مدینہ میں رہا' لیکن وہاں اس نے ایسی کوئی متنازعہ حدیث بیان نہیں کی۔ امام مالکؒ بھی شروع میں اس سے حدیث کا درس لیتے تھے۔ اس کے بعد وہ قرض خواہوں سے بھاگ کر کوفہ منتقل ہو گیا' جہاں اس نے 146 ھ میں بعمر 86 سال وفات پائی۔ تاریخ بغداد کے مصنف جناب خطیب بغدادی نے امام مالکؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہشام بن عروہ ایک دروغ گو انسان تھا..... (تاریخ بغداد' ص 105-104)..... امام مالکؒ کے علاوہ خود اہلِ مدینہ بھی ہشام سے مروی احادیث میں اغلاط کی نشاندہی کرنے لگے تھے..... (تہذیب التہذیب' جلد اول' صفحہ 109 اور جلد دوم' صفحہ 50)۔

16- یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ سیدہ عائشہؓ سے متعلق متعدد احادیث کا براہ راست راوی ہشام بن عروہ نہیں' بلکہ علی بن مسہر نے ہشام کی وفات کے 39 سال بعد اپنے استاد کے حوالے سے یہ احادیث روایت کی ہیں' لیکن اس کے علاوہ کسی ایک محدث نے بھی ان احادیث کی تصدیق نہیں کی۔ ہشام بن عروہ کا اپنا قول ہے کہ جب تم سے کوئی عراقی ایک ہزار احادیث بیان کرے تو نو سو نوے کو زمین پر دے مارو اور باقی دس میں بھی شک کرتے رہو۔ مذکورہ احادیث کا ماخذ ہی عراق ہے' لہٰذا یہ کیسے معتبر ہو سکتی ہیں؟

17- بعض خوش گمان لوگوں کا خیال ہے کہ ہشام کی ذہنی کیفیت کوفہ میں ہجرت کے بعد نارمل نہیں رہی تھی' بلکہ وہ نسیان میں مبتلا اور فاتر العقل ہو چکا تھا۔ اس کی وجہ اس کا ایک بیان ہے کہ ''میری بیوی عمر میں مجھ سے تیرہ برس بڑی تھی اور وہ نو برس کی تھی کہ رخصت ہو کر میرے گھر آئی''..... گویا ہشام کی پیدائش سے چار سال قبل ہی رخصتی بھی ہو گئی؟ بعض محققین کی رائے ہے کہ نسیان کی وجہ سے ہشام نے تسعتہ عشر (انیس) کو صرف تسعتہ (9) بنا ڈالا۔ حافظ ذہبیؒ بیان کرتے ہیں کہ ہشام کی بیوی کی عمر رخصتی کے وقت 29 سال تھی' لیکن اس نے دو عشروں کو گرا کر 9 کر دیا۔ اسی طرح اس نے سیدہ عائشہؓ کی عمر میں سے ایک عشرہ کم کر کے نو بنا ڈالا۔

18- بقول ہشام بن عروہ حضرت عائشہؓ نکاح (نسبت) کے وقت گڑیوں سے کھیلا کرتی تھیں اور شادی والے دن جھولا جھول رہی تھیں' اگر یہ روایت درست بھی ہے تو اس سے عمر کا تعین 6 سال اور 9 سال نہیں ہوتا۔ راقم کی پوتیاں اس جدید دور میں بھی 13/14 سال کی عمر میں گڑیوں سے کھیلتی ہیں اور شاید مزید چند سال تک کھیلتی رہیں گی۔ نیز ہمارے دیہات میں میلوں ٹھیلوں میں اور برسات کے موسم میں بالغ لڑکیاں بھی جھولا جھولتی ہیں۔ اس سے کم عمری کا جواز فراہم کرنا بے منطق فعل ہے۔

19- ہشام کے دور سے قریب ترین دور امام ابوحنیفہؒ کا ہے (80ھ سے 148ھ)' لیکن امام اعظمؒ نے ہشام سے حضرت عائشہؓ کے نکاح کی روایت نقل نہیں کی۔ دوسرے قریب ترین سیرت نگار ابن اسحاق ہیں (85ھ سے 153ھ)' لیکن انہوں نے بھی ہشام کی روایات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا' بلکہ ان کی تحقیق ہشام بن عروہ کی روایات سے متصادم دکھائی دیتی ہے۔ یہ متناقص اور متضاد روایات صحیح بخاری میں حادثتاً یوں جگہ پا گئیں کہ امام بخاریؒ صحیح بخاری کی تدوین اور مزید تحقیق میں شبانہ روز مصروف تھے کہ اسی اثناء میں رحلت فرما گئے' لہٰذا بہت سی روایات جو موازنے کے بعد یقیناً غیر معتبر ٹھہرا کر مسترد کر دی گئی ہوتیں' وہ تمام کی تمام ان کے شاگردوں نے جوں کی توں اپنا لیں اور بغیر کسی ترمیم یا اصلاح کے صحیح بخاری میں شامل کر لیں۔ اسی لئے قاری کو ابواب اور عنوانات میں خاصی بے ربطی محسوس ہوتی ہے اور موضوع کی مناسبت سے متوقع عنوان کے ذیل کے بجائے بہت سی احادیث بالکل غیر متعلقہ عنوانات کے تحت کہیں اور مرقوم پائی جاتی ہیں۔ ان میں ایسی احادیث بھی ہیں جو درایت اور عقلِ سلیم کے خلاف ہیں' کیونکہ امام بخاریؒ کی بے وقت وفات سے مزید تحقیق اور تصدیق کا عمل نامکمل رہ گیا۔ امام مالکؒ ہشام کے اہم ترین شاگرد ہیں' انہوں نے حضرت عائشہؓ کی رخصتی اور نکاح کی روایت نہیں اپنائی' کیونکہ اس وقت تک یہ روایت وضع ہی نہیں ہوئی تھی۔ ابن عروہ کی روایات متصل نہیں' بلکہ منقطع ہیں اور اصولِ حدیث کی رو سے مدلس' یعنی Fabricated ہیں۔

20- ہشام بن عروہ 131ھ تک قیام مدینہ کے دوران عراقی حدیثوں کو ناقابل اعتبار ٹھہراتا رہا' لیکن اس کے عراق پہنچتے ہی اس حدیث (عمر عائشہؓ) کے نو راوی کوفہ سے اور چار بصرہ سے دستیاب ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہشام کے نسیان سے فائدہ اٹھا کر عراقیوں نے خود ہی یہ روایت وضع کی اور ہشام بن عروہ سے منسوب کر کے بعد از وفاتِ ہشام عالم اسلام میں پھیلا دی۔ اس طرح ہشام کی مدنی زندگی میں صحت روایات کے حوالے سے شہرت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر عالم اسلام میں اختلاف اور انتشار کی بنیاد رکھ دی گئی' تاکہ ان کے مذموم عزائم کی تکمیل ہو سکے۔

21- واضح رہے کہ حدیث کی تعریف کی رو سے ''عمر عائشہؓ'' کی روایت حدیث نہیں' بلکہ ''آثار'' کے زمرے میں آتی ہے' لیکن اسے حضور اکرم ﷺ کے فعل میں شمار کرنے کے لئے نو سال کی عمر میں صنفی مقاربت کا قصہ بھی گھڑ لیا گیا' تاکہ یہ ''فعلی حدیث'' کا درجہ حاصل کر سکے۔ صرف یہ امر ہی مذکورہ روایت کے من گھڑت ہونے کا بین ثبوت ہے۔ ہمارے علماء سیدہ عائشہؓ کی کم عمری میں شادی کے اشکال سے آگاہ تھے' لیکن ''مبینہ حدیث'' کے احترام میں انہوں نے یہ جواز ڈھونڈ نکالا کہ عرب کی گرم آب و ہوا میں لڑکیاں جلد جوان ہو جاتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا آج عرب کے محل وقوع میں کوئی تبدیلی واقع ہو گئی ہے یا ایئر کنڈیشنگ کی وجہ سے آب و ہوا تبدیل ہو گئی ہے کہ آج وہاں 9 سال کی عمر میں لڑکیاں بلوغت کو نہیں پہنچ رہیں؟ پاکستان میں سبی اور جیکب آباد کا شمار دنیا کے گرم ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔ کیا وہاں لڑکیاں کم عمری میں بالغ ہو جاتی ہیں؟..... ہمارے بہت سے پاکستانی بھائیوں کے بچے کئی عشروں سے عرب ممالک میں رہائش پذیر ہیں۔ کیا ان کی بچیاں وقت سے پہلے بلوغت کو پہنچ رہی ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان سب سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ غیروں سے شکوہ بجا سہی' لیکن اعتراض کا جواز تو ہم نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ کیا شرف انسانیت کے سب سے بڑے علم بردار کے دامن پر ہماری کسی غفلت یا کوتاہی سے تو چھینٹے نہیں پڑے؟

جب بات حضور اکرم ﷺ کے حوالے سے کی جائے تو یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ راوی کون ہے اور روایت کس کتاب میں مرقوم ہے' بلکہ اہم بات یہ ہے کہ جو کہا گیا ہے آیا وہ شہنشاہ کونین ﷺ کے مجموعی کردار سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ بخاری شریف میں دونوں روایات موجود ہیں۔ ایک کی راوی بی بی عائشہؓ ہیں' جن کا لقب ہی صدیقہ ہے اور دوسری روایات کا راوی ہشام بن عروہ ہے' جسے امام مالکؒ کاذب قرار دے چکے ہیں۔ اب قارئین خود ہی فیصلہ کر لیں کہ کون سی روایت مستند ہے اور کون سی غیر معتبر ہے۔ آج اگر اغیار اس غیر معقول روایت کی بنیاد پر حضور اکرم ﷺ کو ہدف تنقید بنا رہے ہیں تو ایک امتی کی حیثیت سے ہم نے ایسی وضعی روایات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر مسترد کیوں نہیں کر دیا؟ میں تمام درد دل رکھنے والوں کو دعوت فکر و تحقیق دیتا ہوں اور علمائے کرام اور واعظین سے دست بستہ گزارش کرتا ہوں کہ وہ خود تحقیق کر کے سچ تک پہنچنے کے لئے کمر بستہ ہو جائیں اور تب تک اپنے خطبات میں عمر عائشہ صدیقہؓ کے حوالے سے سابقہ موقف کا اعادہ نہ کریں' کیونکہ ہمارا عقیدہ یہی ہے کہ:

دنیا میں احترام کے قابل ہیں جتنے لوگ
میں سب کو مانتا ہوں' مگر مصطفیٰ ﷺ کے بعد

(بشکریہ روزنامہ نوائے وقت و روزنامہ پاکستان لاہور)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

اللہ تعالیٰ کے انسانیت سے روابط کے طریقے

ساری دنیا کے مسلمان اور خصوصاً ہم پاکستان کے باشندے، ایک شدید اضطراب اور افراتفری کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان حالات میں زیادہ توجہ زندگی کے مسائل کی طرف دینی ضروری ہے اور نظری مسائل کے متعلق کچھ تحریر کرنا اس وقت زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ تحریک طلوع اسلام کے نزدیک مسلمانوں کی تمام مشکلات و بلیات کا حل قرآنی نظام کے قیام سے وابستہ ہے۔ قرآنی نظام کے قیام کے بغیر مسلمانوں کے مصائب کسی طرح بھی دور نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہ عقائد جو قرآنی حکومت کے قیام میں مانع ہوں، ان کی نشاندہی کرنا اور ان کی تردید کرنا بھی ایک ضروری امر ہے۔ اگر ہم مسلمانوں کے عقائد ہی قرآنی حکومت کے داعی نہ ہوں، بلکہ ان میں مانع بنتے ہوں تو اسلامی حکومت کسی طرح بھی قائم نہیں ہو سکتی۔ اس پس منظر کو خیال میں رکھنے کے بعد آپ اس مضمون کو ملاحظہ فرمائیں۔

قرآن کریم کی رو سے اللہ تعالیٰ کا انسانیت سے تعلق صرف وحی الٰہی کے ذریعے ہی قائم ہو سکتا ہے۔ وحی الٰہی اور وحی الٰہی پر قائم شدہ نظام وہ واحد ذریعہ ہے جس کے واسطہ سے انسانیت اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کر سکتی ہے۔ آپ خود غور فرمائیں، اور بار بار اس مسئلہ پر غور فرمائیں، وحی الٰہی اور اس پر قائم شدہ نظام کے علاوہ کوئی ذریعہ ایسا ہے ہی نہیں، جس کے واسطے سے اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کیا جا سکے۔ آپ جب قرآنِ کریم کی تلاوت فرماتے ہیں تو تخاطب الٰہی اور مکالمۂ خداوندی سے سرفراز و مشرف ہوتے ہیں۔ جتنی دیر آپ وحی الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں آپ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم رہتا ہے، یہ تعلق وقتی ہوتا ہے، تلاوت کے بعد یہ تعلق ختم ہو جاتا ہے، ہاں اگر آپ ایک اسلامی حکومت میں زندگی گزار رہے ہیں تو پھر آپ کا اللہ تعالیٰ سے مستقل تعلق قائم رہتا ہے۔ اس تعلق میں استمرار ہوتا ہے اور اس میں ہر مسلمان ہر وقت اسلامی حکومت کی اطاعت کرتے ہوئے عبادت الٰہی میں مصروف رہتا ہے اور اس میں آیۂ کریمہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (51:56)۔ (ترجمہ) ''اور میں نے جنوں اور آدمیوں کو اسی غرض سے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں''

کی تعمیل ہر وقت از خود ہوتی رہتی ہے ورنہ غیر اسلامی حکومت میں، اس آیہ پر عمل ہو ہی نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ کا انسانیت سے تعلق صرف وحی کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس میں الہام، کشف، مراقبہ، القاء وغیرہ شامل نہیں ہیں۔ ارشاد عالی ہے: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (3:179)- (ترجمہ) اور خدا ایسا بھی نہیں کہ تمہیں غیب کی باتیں بتا دے مگر ہاں خدا اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے غیب بتانے کے لئے چُن لیتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا O اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (72:26)- (ترجمہ) اللہ ہی غیب کو جانتا ہے اور اپنے غیب کی باتیں ظاہر نہیں کرتا مگر جس پیغمبر کو پسند فرمائے۔ پھر اس (غیب) وحی کو انسانیت تک محفوظ طور پر پہچانے کے لئے وہ انبیاء کرام کی جو نگرانی کرتا ہے، اس کے لئے ارشاد ہوتا ہے: فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا O لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (72:28)- (ترجمہ) (وحی کو بحفاظت پہچانے کے لئے) اس رسول کے آگے اور پیچھے نگہبان (فرشتے) مقرر کر دیتا ہے تاکہ (وہ) دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچا دیئے اور جو کچھ ان کے پاس ہے وہ (اللہ) سب پر حاوی ہے اور اس نے تو ایک ایک چیز گن رکھی ہے۔ وحی الٰہی کو انسانیت تک محفوظ طور پر پہچانے کے لئے یہ حفاظت کی جاتی ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف گنا ہوا اور شمار کیا ہوا ہوتا ہے۔ آپ خود اندازہ فرمائیں کہ جس وحی کے محفوظ پہچانے کا یہ اہتمام کیا جاتا ہے کیا اس میں قرآن کریم کے علاوہ، روایات یا الہام شامل ہو سکتے ہیں۔ ہمارے محدثین کرام کے مطابق تو روایات بغیر الفاظ کے نازل ہوئی ہیں۔ ان کے الفاظ و حروف کی کس طرح گنتی ہو سکتی تھی۔ رہا الہام تو یہ بھی مُلہَم کو بغیر الفاظ کے صرف ایک خیال محسوس ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کو صرف قرآن ملنے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (2:23)- (ترجمہ) اور اگر تمہیں اس چیز کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے کوئی شک ہے تو ایک سورۃ اس کے مانند لے آؤ۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس آیت میں کفار و مشرکین سے تعارض صرف قرآن کا نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہر اس چیز کا تعارض کیا گیا ہے جو بھی رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی ہے۔ اس آیت میں لفظ ما تعمیم کے لئے آیا ہے اور معارضہ پورے ''منزل من اللہ'' کا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے بندے پر جو کچھ بھی نازل کیا ہے اس کے مثل ایک سورہ لے آؤ۔ اس سے واضح ہے کہ جو کچھ نازل ہو رہا تھا وہ صرف سورتیں تھیں، یعنی نازل شدہ چیز صرف

سورتوں پر مشتمل تھی۔ اسی لئے معارضہ صرف سورتوں تک محدود رکھا گیا ہے اگر ''مما نزلنا'' میں احادیث یا الہام شامل ہوتے تو ارشاد ہوتا کہ اگر تمہیں ''مما نزلنا'' میں شک ہے تو تم ایسی ایک آیت یا ایک حدیث بنا کر پیش کرو۔ ''مما نزلنا'' کے مانند صرف سورۃ بنانے کا چیلنج کرنے کے معنے ہی یہ ہیں کہ جو کچھ بھی نازل ہو رہا تھا وہ صرف وہ چیز تھی جو صرف سورتوں پر مشتمل تھی اور جس کا مثل نہیں بن سکتا تھا۔ ہمارے مفسرین کرام نے عمداً اور دانستہ اس آیت میں معارضہ کو صرف قرآن تک محدود کر دیا ہے حالانکہ آیت میں قرآن کا لفظ تک نہیں ہے۔ اگر معارضہ صرف قرآن تک محدود ہوتا تو ارشاد ہوتا: **وان کنتم فی ریب مما نزلنا فی القران.** لیکن چونکہ معارضہ صرف قرآن تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر اس چیز کا معارضہ ہے جو بھی نازل ہوئی ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ صرف قرآن تھا' کیونکہ قرآن کا ہی مثل نہیں بن سکتا۔ اس آیت میں ''مما نزلنا'' کے زمرہ میں احادیث دور دور تک بھی نہیں آ سکتیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ احادیث کا چونکہ مثل بن سکتا ہے' اس لئے وہ اس آیت کے مطابق ''منزل من اللہ'' یا وحی الٰہی قرار نہیں دی جا سکتیں۔ اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کا رابطہ انسانیت کے ساتھ صرف قرآن کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے' روایات (وحی خفی) یا الہام رابطہ کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔

تحریک طلوع اسلام کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا رابطہ انسانیت سے صرف اس کے نظام کی معرفت ہو سکتا ہے' قرآن کریم نے انسانیت سے جو وعدے کئے ہیں وہ وعدے نظام کے ذریعے ہی پورے ہوتے ہیں اور وہ وعدے جس قدر پورے ہوتے جاتے ہیں یہ رابطہ اسی قدر پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا رابطہ ہے جو اس دنیا میں ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ یہ کوئی خفیہ یا انفرادی رابطہ نہیں ہوتا۔ چونکہ اسلامی حکومت کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی صرف اسی رابطہ سے ہو سکتی ہے۔ اس رابطہ کے علاوہ کسی طرح بھی اللہ کی عبادت نہیں ہو سکتی۔ ہمارے علماء کرام چونکہ اسلامی حکومت یا اسلامی نظام کے قائل ہی نہیں ہیں' اس لئے وہ اس رابطۂ خداوندی کو بالکل Ignore کر دیتے ہیں' وہ ختم نبوت کے بعد الہام کو اللہ تعالیٰ سے رابطہ کا اصل ذریعہ گردانتے ہیں' لیکن ہمارے علماء کرام کا یہ نظریہ بالکل قرآن کے خلاف ہے۔ اس لئے اس مضمون میں چند گذارشات الہام کے بارے میں پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سارے قرآن میں الہام کا لفظ ہی نہیں آیا' یہ اصطلاح ہی غیر قرآنی اور تصوف زدہ حضرات کی وضع کردہ ہے۔ اس کا قرآن کریم سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ البتہ قرآن میں صرف ایک جگہ اس مادہ سے'

الھم کا لفظ آیا ہے۔ جو اصطلاحی نہیں بلکہ لغوی معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں اس اصطلاحی ''الہام'' کا کوئی تعلق ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ سورہ الشّمس میں ارشاد ہوتا ہے: **وَنَفْسٍ وَمَا سَوّٰاهَا O فَاَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰاهَا** (91:7-8)- (ترجمہ) نفس انسانی اور جو قوتیں اس کو درست رکھتی ہیں' اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر فجور وتقویٰ کی امکانی صلاحیتیں رکھ دی ہیں۔ اس جگہ الہام کے وہ اصطلاحی معنے لگ ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ علماء کرام کے نزدیک تو الہام صرف بڑے بڑے عبادت گذاروں' متقیوں' پرہیز گاروں اور اولیاء کرام کو ہوسکتا ہے۔ جوان کوان کی عبادت وریاضت کے صلہ میں ملتا ہے۔ اس آیت میں تو ایسی کوئی تشخیص ہی نہیں ہے۔ اس میں اولیاء اللہ تو ایک طرف مومن وکافر کا بھی فرق نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ الہام تو ہر انسان کو ازخود ہوتا ہے' اس میں کسی عبادت وریاضت کا دخل ہی نہیں ہے۔ اس لئے یہ آیہ کریمہ مقصد زیرِنظر کے لئے کسی طرح بھی مفید نہیں ہوسکتی۔

ہمارے علماء کرام کا یہ نظریہ ہے کہ الہام دوطرح کا ہوتا ہے ایک الہام تو اولیاء اللہ کو ہوتا ہے اور ایک الہام انبیاء کرام کو ہوتا تھا۔

انبیاء کرام کے اسی الہام کو یہ حضرات وحی خفی بھی کہتے ہیں اور یہی وحی خفی احادیث میں روایت کر دی گئی ہے۔

جہاں تک اولیاء اللہ کے الہام کا تعلق ہے تو اس بارے میں عرض ہے کہ ہمارا تصور ہی اولیاء اللہ کے متعلق غلط ہے۔ اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ ہوتا ہی نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: **اَلا اِنَّ اَوْلِیَاء اللّٰهِ لاَخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلاَهُمْ یَحْزَنُوْنَ Oالَّذِیْنَ آمَنُواْ وَکَانُواْ یَتَّقُوْنَ** (10:62-63)- آگاہ رہو کہ اس میں شک نہیں کہ دوستانِ خدا پر نہ خوف ہوتا ہے اور نہ انہیں حزن ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا پر ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ آیہ کریمہ نے خود ہی ولی کی تعریف Definition بیان کردی ہے کہ: ''جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرے وہ ولی اللہ ہے۔''

قرآن کریم میں اولیاء اللہ کے مقابل اعداء اللہ کا بھی تذکرہ آیا ہے ''ولی'' اور ''عدو'' ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لئے ولی اللہ کے صحیح معنے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ''عدواللہ'' کے قرآنی مفہوم کو بھی سامنے رکھ لیا جائے۔ ارشاد ہوتا ہے: (اے مسلمانو) کفار کے مقابلے کے لئے جہاں تک تم سے ہوسکے قوت حاصل کرو۔ **تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّکُمْ** 8:60' اس سے تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو ڈراؤ۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: **یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَاء** (60:1)- اے ایمان والوٴ میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناوٴ۔ ان دونوں آیات میں اور ان کے علاوہ دیگر آیات میں بھی

اللہ تعالیٰ نے مومنین کے دشمنوں کے علاوہ خود اپنے دشمنوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اللہ کا دشمن کون ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے دشمن صرف وہی ہو سکتے ہیں جو اللہ کے نظام اور اس کی حکومت کے قائم کرنے میں رکاوٹ بنیں۔ اس لئے اولیاء اللہ صرف وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو اسلامی حکومت قائم کرتے ہیں اور اس کے قائم کرنے میں رات دن کوشاں رہتے ہیں' ان اولیاء اللہ کو الہام کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ان کا رابطہ تو ہر وقت اللہ تعالیٰ سے اس نظام کی معرفت قائم رہتا ہے۔

اب رہا وہ الہام جو ان حضرات کے نزدیک انبیاء کرام کو ہوتا تھا' اس کے متعلق عرض ہے کہ اس کی بھی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں مل سکتی۔ مضمون کے شروع میں وہ آیات پیش خدمت عالی کی گئی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضورﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن ہی وحی کے ذریعے ملا ہے۔ اس کے علاوہ ایک لفظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضورﷺ کو نہیں ملا۔ (36:69, 29:51)- الہام کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ ہر جگہ حضورﷺ پر وحی نازل ہونے کا ذکر ہے۔ (42:13, 42:3, 35:31,)- 6:19, 43:43)' قرآن کریم میں کسی جگہ بھی حضورﷺ پر الہام ہونے کا ذکر تک نہیں ہے۔ ایک جگہ حکم ہے کہ وحی دی گئی ہے اس کی تلاوت کرو 13:30' الہام میں تو الفاظ ہوتے ہی نہیں ان کی تلاوت کس طرح ہوسکتی ہے۔ پھر اسی طرح حکم ہے کہ جو وحی تیری طرف کی جاتی ہے اس کا اتباع کرو 10:109, 10:15, 7:203, 6:107, 6:50, 33:2' پورے قرآن میں کسی جگہ بھی حضورﷺ کو الہام کے اتباع کا حکم نہیں دیا گیا۔

ہمارے علماء کرام خود اس بات کے قائل ہیں کہ وحی اور الہام میں سورج اور چراغ کی نسبت ہوتی ہے۔ کیونکہ وحی قطعی اور الفاظ کے ساتھ ہوتی ہے جبکہ الہام بالکل ظنی' اور مشکوک' اور صرف مفہوم کی شکل میں ملتا ہے۔ اس بات کا علماء کرام خود اعتراف کرتے ہیں۔ پھر سوچنے کی یہ بات ہے کہ جس عالی مرتبت ہستی' رسول یا نبی کو وحی ملتی ہو' اس کو الہام کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔ جب حضورﷺ کو وحی جلی' جو سراج منیر اور ایک ایسی روشن قندیل ہے جو ساری دنیا کو روشن کر دے' تو ان کو الہام کی کیا ضرورت باقی رہ گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو الہام کیا اور اس کے ذریعے احادیث نازل کی گئیں۔

ہمارے علماء کرام کے نزدیک الہام میں صرف مفہوم بلا الفاظ کے دل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ سابقہ ادوار میں تو چل سکتا تھا لیکن اس دور میں جبکہ سائیکالوجی (نفسیات) نے اتنی ترقی کر لی ہے' اس نظریہ کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ بغیر الفاظ کے صرف مفہوم کو کسی Nonsensical کی طرف منتقل کر دینا Imposibility ہے۔ بغیر الفاظ کے کسی حال میں بھی تنہا

مفہوم کسی کی طرف منتقل (Convey) نہیں کیا جا سکتا۔

جب قرآن کریم سے براہ راست الہام کا کوئی ثبوت دستیاب نہیں ہو سکا تو ہمارے علماء کرام نے ایسی آیات کی تلاش شروع کر دی جن سے بالواسطہ الہام کی طرف اشارہ ملتا ہو۔ اس بارے میں تین آیات زیادہ نمایاں ہیں۔ الہام کے بارے میں مضمون کو مکمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان آیات کا قرآنی مفہوم بھی پیش خدمت عالی کر دیا جائے۔

ارشاد ہوتا ہے: **وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ آمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ (5:111)**- اور جب میں نے وحی کی حواریوں کی طرف کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر تو کہنے لگے ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہنا کہ ہم فرمانبردار ہیں۔ اس آیہ کریمہ میں **اوحیت** کا لفظ حواریوں کے بارے میں آیا ہے۔ اس سے یہ حضرات یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگرچہ حضرت عیسیٰ کے حواری نبی نہیں تھے تاہم جب ان کی طرف وحی ہو سکتی ہے تو غیر از انبیاء کی طرف بھی وحی ہو سکتی ہے اور وہی الہام ہوتا ہے۔

ہمارے علماء کرام کی یہ دلیل درست نہیں ہے۔ اس آیت میں حضرت عیسیٰ کا نام محذوف ہے۔ حواریوں کو یہ وحی حضرت عیسیٰ کی معرفت ہوئی تھی انہیں براہ راست نہیں ہوئی تھی۔ جس طرح قرآن کریم میں دیگر مقامات میں حضورﷺ کا نام نامی محذوف ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (2:183)**- ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔ یہاں خطاب براہ راست مومنین سے نہیں ہے بلکہ یہ خطاب حضورﷺ کی معرفت ہے۔ اس نظریہ میں ہم منفرد نہیں ہے اور مفسرین نے بھی ہمارے اس نظریہ کی تائید کی ہے۔

(1) تفسیر مظہری نہایت بلند تفسیر شمار کی جاتی ہے' اس تفسیر میں قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے تحریر فرمایا ہے: ''عبد بن حمید نے قتادہ کا اور ابوالشیخ نے سُدی کا یہی قول بیان کیا ہے کہ بعض علماء کے نزدیک وحی سے مراد حضرت عیسیٰ کی زبانی حکم بھیجنا ہے۔

(2) جلالین میں **اوحیت** کے ذیل میں تحریر ہے: ''چونکہ اصطلاح شرع میں وحی انبیاء کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے اس لئے مفسر علام کو وحی بالواسطہ سے تاویل کرنی پڑی۔'' آپ غور فرما رہے ہیں کہ کس طرح جلالین ہمارے الفاظ کو دہرا رہی ہے۔ ہمارے نظریہ کے مطابق اس کے نزدیک بھی وحی صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے اور اس آیت میں حواریوں کو وحی بالواسطہ ملی تھی۔

(3) علامہ پیر کرم شاہ صاحب ازہری نے ضیاء القرآن میں تحریر فرمایا ہے کہ ''اگر یہ حواری انبیاء تھے جیسے بعض علماء کا خیال ہے تو وحی سے مراد وہ وحی ہو گی جو اللہ تعالیٰ انبیاء پر نازل فرماتا ہے۔''

(4) تفسیر نمونہ ایران کی موجودہ دور کی تفاسیر میں نہایت نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ اس میں تحریر ہے ''یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس سے وہ وحی مراد ہو جو حضرت مسیح کے ذریعے اور معجزات کی شکل میں ان کی طرف بھیجی جاتی تھی۔'' (جلد سوم' صفحہ 262)۔

(5) امام راغب اصفہانی نے ''مفردات'' میں تحریر فرمایا ہے ''واذ اوحیت الی الحوارین'' اور جب میں نے حواریوں کو حکم بھیجا''۔ میں حضرت عیسیٰ کے حواریوں کی طرف وحی بھیجنے سے حضرت عیسیٰ کی وساطت سے ان کو حکم دینا مراد ہے۔''

امید ہے کہ جو اقتباسات مستند تفاسیر سے پیش خدمت عالی کئے گئے ہیں' ان سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ان تمام تفاسیر نے ہماری تائید کی ہے کہ وحی صرف انبیاء کرام کو ہوتی تھی اور زیر نظر آیت سے الہام کی کوئی سند نہیں ملتی۔

ہمارے علماء کرام اس بارے میں دو آیات اور پیش کرتے ہیں' یہ دونوں آیات حضرت موسیٰؑ کی مادر گرامی سے متعلق ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

(i) اِذْ اَوْحَیْنَا اِلَی اُمِّکَ مَا یُوحَی O اَنِ اقْذِفِیْهِ فِیْ التَّابُوتِ (20:38-39)۔ (اے موسیٰ) جب ہم نے تیری ماں کی طرف وحی کی کہ وہ مجھے ایک صندوق میں ڈال دے اور اس صندوق کو دریا میں بہا دے۔

(ii) وَاَوْحَیْنَا اِلَی اُمِّ مُوسَی اَنْ اَرْضِعِیْهِ (28:7)۔ اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کی ماں کو کہ اس کو دودھ پلاتی رہ۔ (ترجمہ شیخ الہند)۔

اس بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا کہ وحی صرف مردوں کو ہوتی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے:

(1) وَمَا اَرْسَلْنَا مِن قَبْلِکَ اِلَّا رِجَالاً نُّوحِیْ اِلَیْهِم مِّنْ اَهْلِ الْقُرَیٰ (12:109)۔

(2) وَمَا اَرْسَلْنَا مِن قَبْلِکَ اِلَّا رِجَالاً نُّوحِیْ اِلَیْهِمْ فَاسْاَلُوا اَهْلَ الذِّکْرِ (16:43)۔

(3) وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ اِلَّا رِجَالاً نُّوحِیْ اِلَیْهِمْ فَاسْاَلُوا اَهْلَ الذِّکْرِ (21:7)۔

ان تینوں آیات کریمات میں ارشاد ہوتا ہے کہ وحی صرف مردوں کی طرف ہی نازل ہوتی تھی۔ واضح رہے کہ ان آیات میں لفظ الا حصر کے معنے میں استعمال ہوا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ وحی صرف مردوں کو ہی ملتی تھی۔ عورتوں کو وحی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ حضرت حسن بصری نے کہا کہ اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ نے کسی جن کو پیغمبر بنایا نہ کسی عورت کو نہ کسی خانہ بدوش کو۔ (تفسیر مظہری' جلد 5' ص 144)۔

ان تینوں آیات سے واضح ہو رہا ہے کہ حضرت موسیٰ کی والدہ کو وحی نہیں ہو سکتی تھی۔

اوحی کے معنے ''کسی حکم کا دوسرے کی طرف کسی کی معرفت بھیجنا'' بھی ہوتے ہیں۔ جس کی مثال حواریوں کے سلسلہ میں پیش کی جا چکی ہے۔ وہاں حضرت عیسیٰ کی معرفت حواریوں کو حکم بھیجا گیا تھا۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ یہ بنی اسرائیل کی قوم نبیوں کو مانتی تھی۔ ان

میں قریہ قریہ، بستی بستی، نبی موجود رہے۔ **وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلاً (16:36)**۔ اور ہم نے ہر اُمّت میں رسول بھیجا۔ بعض مرتبہ دو دو تین تین رسول ایک ہی جگہ ہوتے تھے۔ (36:14) اس دور میں ایک ایک گاؤں اور ایک ایک گروہ میں نبی موجود تھا اس لئے یہاں **اوحینا** کے معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی نبی کے ذریعے ام موسیٰ کی طرف یہ پیغام بھیجا تھا۔

یہ وہ تین آیات کریمات ہیں جن کا سہارا لے کر ہمارے علمائے کرام کسی کو الہام ہونے کے نظریہ کو ثابت کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں براہ راست الہام کا کوئی ذکر نہیں آیا، نہ الہام کا کوئی ثبوت قرآن سے کسی طرح بھی مل سکتا ہے۔ افسوس، صد افسوس، اس بات پر ہوتا ہے کہ اس موہومہ ومزعومہ الہام کے نظریہ پر سارے تصوف، تشیع اور احمدیت و قادیانیت کی عمارتیں استوار کی گئی ہیں۔ الہام کے نظریہ کے بعد کسی بھی ہیئت اجتماعیہ کا تصور باقی رہ ہی نہیں سکتا کیونکہ الہام کے نظریہ کا لازمی ومنطقی نتیجہ ذاتی و انفرادی نجات اور پرستش کرنا ہوتا ہے، الہام کے نظریہ کے ہوتے ہوئے اسلامی مملکت کا کوئی نظریہ باقی نہیں رہ سکتا نہ ہی کوئی اسلامی نظام قائم ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے انسانیت کا رابطہ صرف قرآن اور قرآنی نظام کے ذریعے ہوسکتا ہے اور اسی کے ذریعے اس کی اطاعت وعبادت ہوسکتی ہے۔

یکے از مطبوعات ادارہ باغبان ایسوسی ایشن

سیلاب زدگان کی امداد

ادارہ باغبان ایسوسی ایشن کے تمام عہدیداران، تاحیات ممبران، عام ممبران، متفقین، ہمدرد اور باغبان ایسوسی ایشن کو بنظر تحسین دیکھنے والے تمام خواتین وحضرات سے پُر زور اپیل کرتا ہے کہ وہ سیلاب زدگان کی امداد کے لئے آگے آئیں، خود بھی اس میں حصہ ڈالیں اور دوسروں کو بھی انسانیت کے نام پر امداد کی اپیل کریں۔ دی جانے والی امداد کی تفصیل سے اگر مناسب خیال کریں تو آگاہ بھی کردیں۔ بہت بہت شکریہ!

پتہ رابطہ: ملک حنیف وجدانی، صدر باغبان ایسوسی ایشن، سنبل سیداں، نیومری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام احمد پرویز

قرآنِ کریم کی رُو سے

عُلَماء کون ہیں؟

سلیم کے نام ایک خط

عُلَماء کون ہیں؟

اس میں کوئی شبہ نہیں سلیم! کہ علم وجۂ شرفِ انسانیت ہے لیکن سوال یہ ہے کہ علم کہتے کسے ہیں اور علماء کون ہیں؟ قرآن نے اس سوال کا جواب بڑا جامع اور مفصل دیا ہے لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے چند الفاظ تمہیداً ضروری ہیں، انہیں غور سے سننا۔

علم کی دنیا میں حکمائے یونان کا جو مقام ہے اس سے تم واقف ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک انسانیت کی جس قدر تاریخ ہمارے سامنے آ چکی ہے اس میں علم و حکمت کی داستان کا آغاز ہی درس گاہ یونان سے ہوتا ہے۔ ان میں سقراط (Socrates) کو ابوالآباء اور افلاطون (Plato) کو اس کے بہترین شارح، اور بجائے خویش ایک مکتبِ فکر کے موسس کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن سقراط صرف انسان کو قابلِ مطالعہ سمجھتا ہے کائنات کو نہیں اور افلاطون عالمِ محسوس کے وجود ہی پر خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ کائنات جو ہمیں اس طرح محسوس (Concrete) دکھائی دیتی ہے، اپنا وجود ہی نہیں رکھتی۔ اصلی اور حقیقی کائنات عالمِ مثال (World of Ideas) میں ہے اور یہ مرئی (Visible) کائنات اس حقیقی دنیا کا عکس ہے۔ لہٰذا اس کائنات کے متعلق جو علم حواس (Senses) کے ذریعے حاصل کیا جائے یعنی (Perceptual Knowledge) وہ قابلِ اعتماد ہی نہیں۔ یقینی علم وہ ہے جو آنکھیں اور کان بند کر کے عالمِ تصور میں حاصل کیا جائے۔

تصوف

افلاطون کا یہی فلسفہ ہے جس پر یونانی تصوف کی عمارت، استوار ہوئی۔ اسی نے ہندوستان میں پہنچ کر ویدانت کی شکل اختیار کی۔ چنانچہ ہندو فلسفہ کی رو سے

پراکرتی (مادی دنیا) مایا (فریب) ہے یہ سب برہما کا سپنا (خدا کا خواب) ہے۔ یہ ایشور کی لیلا ہے۔ یعنی ناٹک کا کھیل جس میں کوئی شے حقیقی نہیں ہوتی بلکہ حقیقت کی تمثیل ہوتی ہے۔ نہ بادشاہ' بادشاہ ہوتا ہے نہ غلام' غلام۔ نہ دریا' دریا ہوتا ہے' نہ پہاڑ' پہاڑ۔ یہ سب فریبِ نگاہ ہوتا ہے۔ اسی بناء پر ہندو فلسفہ میں خدا کو نٹ راجن کہا جاتا ہے۔ یعنی نٹوں (ایکٹروں' کھلاڑیوں) کا بادشاہ! اس مقام پر ضمناً یہ بھی سمجھ لو سلیم! کہ کائنات کو اس طرح باطل قرار دینے کا نتیجہ تھا کہ اس کی طرف سے انسان کے دل میں منفی اسلوب (Negative Attitude) پیدا ہو جائے۔ یہی منفیانہ اندازِ نگاہ تھا جس نے ''خدا پرست'' انسانوں کی نگاہ میں دنیا کو قابلِ نفرت بنا دیا۔ یہی فلسفہ ہے جو ایرانی تصوف کے راستے مسلمانوں میں بھی آ گیا اور ان کی زندگی کے ہر گوشے کو متاثر (اور مسموم) کر گیا۔ ہمارے تصوف کی ساری عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے اور ہماری شاعری چونکہ اسی تصوف کی نقیب ہے اس لئے ہمیں بھی قدم قدم پر اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کبھی سقراط کے اتباع میں یہ کہا جاتا ہے کہ

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سَرو و سمن درا
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دِل کُشا بہ چمن درا

(بیدلؔ)

اور کبھی افلاطون کے تتبع میں یہ کہ

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اور اسی سے ہمارے ہاں بھی دنیا قابلِ نفرت سمجھی جانے لگی (یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں)۔

قرآن کا چیلنج

بہرحال سلیم! میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن سے پہلے کائنات سے متعلق نظریہ یہ تھا کہ اس کا حقیقی وجود کچھ نہیں۔ یہ محض فریبِ تخیّل ہے' سراب ہے' سایہ ہے' وہم ہے' گمان ہے اور جب کائنات وہم و فریب ہے تو اس کے متعلق علم بھی درحقیقت علم نہیں' ظن و گمان ہے۔ قرآن آیا اور اس نے (ہر باطل تصور کی طرح) افلاطون کے اس طلسم کی بھی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ اس نے تصوف اور ویدانت کے نظر فریب تخیلات میں الجھی ہوئی انسانیت کو للکار کر پکارا اور کہا کہ: **وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلاً**. کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے۔ ہم نے اسے باطل پیدا نہیں کیا۔ **ذَٰلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا**. یہ ان لوگوں کا ظن و خیال اور وہم و گمان ہے جو حقیقت سے انکار کرتے ہیں۔ **فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ** (38:27)- اور جو لوگ اتنی بڑی حقیقت سے انکار کریں (دنیا کو باطل اور قابلِ نفرت ٹھہرائیں) تو ان کے

اس انکار کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے ایک آیت میں صدیوں کے غلط تصور کو کس طرح جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا اور اس کے انسانیت سوز نتائج کو کس طرح بے نقاب کر دیا ہے! پھر اس پر بھی غور کرو کہ قرآن نے کائنات کو باطل قرار دینے اور اس کی طرف سے منفیانہ تصور رکھنے والوں کو 'کافر' کہہ کر پکارا ہے۔ تم نے سوچا کہ قرآن کی رو سے کفر اور ایمان کی حدیں کہاں تک چلی جاتی ہیں اور کافر و مومن کے امتیازی خصائص کیا ہیں؟ اور پھر یہ جو کہا کہ اس قسم کے منفیانہ اندازِ نگاہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانیت کی مزرع ہستی جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ تو یہ کتنی بڑی تاریخی حقیقت کا بیان ہے؟ کائنات کے متعلق منفیانہ اندازِ نگاہ کا مظہر مسلکِ خانقاہیت ہے۔ اسی کو ویدانت اور تصوف کہتے ہیں۔ تم اس مسلک کی تاریخ پر غور کرو اور دیکھو کہ اس راستہ میں انسانوں نے جس قدر جانکاہ مشقتیں اٹھائیں اور صبر طلب ریاضتیں کی ہیں ان کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلا کہ انسان کی عمرانی زندگی کی ہری بھری شاخیں جھلس کر رہ گئیں۔

یہ تو تھا کائنات کو باطل قرار دینے والوں کے خلاف اعلانِ جنگ۔ اس کے بعد مثبتانہ انداز میں کہا کہ: **خَلَقَ اللّٰهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِ** ۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا نے اس پست و بلند کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ کائنات حقیقت پر مبنی (Real) ہے فریبِ تخیل نہیں۔ یہ یکسر تعمیری مقاصد کے لئے پیدا کی گئی ہے تخریبی نتائج کے لئے نہیں۔ **اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ** (29:44)- ' اس انکشافِ حقیقت میں جو قرآن نے کیا ہے۔ علم و آگہی کی بہت بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔ دیکھو سلیم! سابقہ آیت میں کائنات کو باطل قرار دینے والوں کو کافر کہا گیا تھا۔ زیرِ نظر آیت میں اسے حق سمجھنے والوں کو مومن قرار دیا گیا ہے۔ دیکھا تم نے سلیم! کہ قرآن کس طرح اپنے مطالب کو خود ہی واضح کرتا چلا جاتا ہے۔

کائنات کو ایشور کی لیلا' قرار دینے والوں کے نظریہ کے ابطال میں کہا کہ: **وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لَاعِبِیْنَ** (44:38)- کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے یونہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ تخلیق کائنات ایک نہایت اہم (Serious) پروگرام کا جزو ہے۔ کھیل تماشہ نہیں۔ اسے بالحق پیدا کیا گیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن اپنے اس دعوے کو (کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے) یونہی منوانا چاہتا ہے یا علم و برہان کی رو سے تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے

قرآن اپنے ہر دعوے کو علم و برہان کی بنیادوں پر پیش کرتا اور فکر و بصیرت کی رو سے ماننے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں بھی اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ: یُفَصِّلُ الآیَاتِ لِقَوْمٍ یَعْلَمُونَ (10:5)- ہم ان حقائق کو ان لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

علم کی قرآنی تعریف

یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ علم کسے کہتے ہیں؟ سنو سلیم! قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے وہ کہتا ہے کہ: وَلاَ تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهِ عِلْمٌ. یاد رکھو کہ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ آیت کا اتنا حصہ بھی کچھ کم حقیقت کشا اور بصیرت افروز نہیں لیکن اس کے بعد چند الفاظ نے علم کی ایک ایسی تعریف (Definition) دے دی ہے۔ جس سے ساری بات نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ فرمایا: إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ أُولـئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلاً (17:36)- یہ حقیقت ہے کہ تمہاری سماعت' بصارت اور فوأد۔ ہر ایک پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ تم نے سمجھا سلیم! کہ بات کیا ہوئی؟ قرآن سمع (سننے) اور بصر (دیکھنے) کو انسانی حواس (Senses) کے معنوں میں استعمال کرتا ہے اور فوأد وہ چیز ہے جسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں (Mind) کہا جاتا ہے۔ انسانی حواس (سمع و بصر) معلومات (Data) فراہم کر کے انسانی فوأد (Mind) تک پہنچاتی ہیں اور فوأدان سے استنباط نتائج کرتا ہے۔ تم کار تو س کی آواز سنتے ہو تو فوراً اس نتیجہ پر پہنچتے ہو کہ کسی نے بندوق چلائی۔ اس کے بعد چیخ کی آواز سنتے ہو تو سمجھ لیتے ہو کہ کسی کے گولی لگ گئی اور باہر جا کر دیکھتے ہو کہ جسے گولی لگی ہے وہ تمہارا دوست ہے تو گولی چلانے والے کے خلاف تمہارے دل میں آتشِ انتقام بھڑک اٹھتی ہے۔ اس تمام واقعہ میں تمہارے سمع و بصر و فوأد کی شہادت موجود ہے۔ لہٰذا یہ علم ہے لیکن اگر تم نہ بندوق کی آواز سنو نہ کسی چیخ کی۔ نہ اپنے دوست کو تڑپتا دیکھو۔ نہ کسی گولی چلانے والے کو اور یونہی کسی کی بات سن کر ایک شخص کی جان کے لاگو ہو جاؤ تو تمہارا یہ فعل علم پر مبنی نہیں ہوگا کیونکہ اس میں تمہارے سمع و بصر کی شہادت موجود نہیں۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن علم کے بارے میں حواس (Sense Perception) کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ یہ دوسری ضرب ہے جو وہ افلاطونی تصور کے خلاف لگاتا ہے اور اسے پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ افلاطون نے کہا تھا کہ حواس کے ذریعے حاصل کردہ علم پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن نے کہا کہ جس بات کی شہادت سمع و بصر نہ دے وہ علم پر مبنی نہیں لیکن صرف سمع و بصر ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ فوأد بھی۔

سمع و بصر سے کام نہ لینے والے

سمع و بصر و قلب کی اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ ان سے کام نہیں لیتے وہ انسانی سطح پر نہیں بلکہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ انہیں جہنمی قرار دیتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے: وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيراً مِّنَ الْجِنِّ وَالإِنسِ۔ جن و اِنس (شہری اور صحرائی آبادیوں کے) میں اکثر وہ لوگ ہیں جو اس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں جو انہیں سیدھی جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لاَّ يَفْقَهُونَ بِهَا۔ ان کی روش یہ ہے کہ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لاَّ يُبْصِرُونَ بِهَا۔ وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ آذَانٌ لاَّ يَسْمَعُونَ بِهَا۔ وہ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ أُوْلَـئِكَ كَالأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ۔ أُوْلَـئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (7:179)۔ یہ علم و حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اس سے بھی واضح ہے کہ علم وہی علم ہے جس کی شہادت سمع و بصر و قلب دے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا علم نظری مباحث (Theoretical Problems) کے متعلق نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ایسے امور میں سمع و بصر کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا۔ سمع و بصر کا تعلق مظاہرِ فطرت کے مشاہدات اور کائناتی نظام کے مطالعہ سے ہے۔ یعنی کائنات کے ایک ایک گوشے کو غور و فکر سے دیکھنا۔ اس عظیم القدر اور محیر العقول مشینری کے ایک ایک پرزے کا مشاہدہ کرنا۔ پھر مختلف تجربات کی رو سے یہ دیکھنا کہ ان پرزوں کی ساخت و پرداخت میں کون سا قانون اور ان کی نقل و حرکت میں کونسی اسکیم کارفرما ہے۔ اسی کو دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں علم سائنس (Scientific Knowledge) کہتے ہیں اور اسی کو قرآن مومنین کا شعار بتاتا ہے۔

خدا کا ذکر کرنے والے

غور کرو سلیم! کہ قرآن اس حقیقت کو کس قدر واضح اور حسین انداز میں بیان کرتا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے: إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لِّأُوْلِي الأَلْبَابِ (3:190)۔ یقیناً اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں صاحبانِ عقل و شعور کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ کن اربابِ دانش کے لئے؟ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّهَ قِيَاماً وَقُعُوداً وَعَلَى جُنُوبِهِمْ۔ ان کے لئے جو اٹھتے بیٹھتے۔ لیٹتے ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ۔ یعنی تخلیقِ ارض و سما میں

غور وفکر کرتے رہتے ہیں اور اپنے مشاہدات وتجارب کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَـذا بَـاطِلاً ۔اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تو نے کائنات کی کسی شے کو بیکار یا تخریبی نتائج کے لئے پیدا نہیں کیا۔غور کیا سلیم! کہ یہ کتنی بڑی بات ہے جو قرآن نے کہی ہے۔قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ کائنات کی کوئی شے نہ عبث و بیکار ہے اور نہ محض تخریبی نتائج کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ ہر شے ایک متعین مقصد رکھتی ہے اور نوعِ انسانی کے لئے کسی نہ کسی پہلو سے نفع بخش ہے لیکن قرآن کا یہ مقصد نہیں کہ ہم اس کے دعویٰ کو یونہی مانتے رہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا فریضہ ہے کہ تم کائنات کی ایک ایک چیز پر غور کرو اور مسلسل مشاہات اور پیہم تجربات کے بعد ان کے متعلق یہ ثابت کرو کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذا بَاطِلاً۔سوچو سلیم! یہ کتنا بڑا پروگرام ہے جو قرآن نے جماعتِ مومنین کے سامنے رکھا ہے۔ یہ کتنی عظیم ذمہ داری ہے جو ان پر عائد کی گئی ہے۔کائنات کی ہر شے کے متعلق عملاً ثابت کرنا کہ وہ فلاں فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ یہ ہے قرآن ماننے والوں کا فریضہ! غور کرو کہ اس کے لئے کس قدر وسیع اور عمیق سائنٹیفک تحقیقات کی ضرورت ہے۔اس کے لئے کتنی بڑی بڑی معمل (Laboratories) درکار ہیں۔ تمہیں یاد ہے کہ اگلے دنوں جاوید تم سے پوچھتا تھا کہ ابا جان! اللہ میاں نے بھڑوں کو کاہے کے لئے بنا دیا ہے۔ یہ تو ہر ایک کو کاٹتی پھرتی ہیں اور بھلے چنگے آدمی کا منہ سجا دیتی ہیں' بالآخر ان سے فائدہ کیا ہے؟ ان کا فائدہ نہ تم بتا سکتے تھے نہ کوئی اور۔لیکن اگلے دنوں جنوبی امریکہ سے ایک خبر آئی کہ وہاں ایک قسم کا کیڑا پیدا ہوتا ہے جو بعض قیمتی پودوں کو سخت نقصان پہنچاتا ہے۔اس کا کوئی علاج ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر مسلسل مشاہدات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ان کیڑوں کو بھڑیں کھا جاتی ہیں۔اب انہوں نے مختلف گرم ممالک سے بھڑیں جمع کر کے اپنے ملک میں پھیلانا شروع کر دیا ہے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو سلیم! علیٰ وجہ البصیرت پورے حتم ویقین سے کہہ سکتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذا بَـاطِلاً ۔اے کائنات کے نشو ونما دینے والے! تو نے بھڑوں کو بھی تخریبی کاموں کے لئے پیدا نہیں کیا۔ یہ بھی کائنات کی نشو ونما میں تعمیری کام کرتی ہیں سُبْحَانَکَ یہ تجھ سے بہت بعید ہے کہ کسی شے کو محض تخریب کے لئے پیدا کر دے۔ یہ چیز تیری شانِ ربوبیت سے بہت دور ہے۔ یہ تو ہماری کم علمی اور سائنٹیفک تحقیقات کا فقدان ہے۔ جو ہم ان کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر' فلہٰذا ان کی زہر پاشیوں سے جھلستے اور تڑپتے رہتے ہیں۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ تو ہمیں ان تحقیقات کی توفیق عطا فرما تا کہ ہم اس قسم کے دردناک عذاب سے محفوظ رہیں۔فَقِنَا عَذَابَ

النَّارِ (3:191)۔ اس لئے کہ جو قومیں اس قسم کی تحقیقات (Researches) سے اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتی ہیں۔ وہ تسخیرِ فطرت نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا دنیا میں ذلت وخواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔

کائنات میں آیات اللہ

رَبَّنَا إِنَّکَ مَن تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ۔ اور پھر ان ظالمین کا دنیا میں کوئی یار و مددگار نہیں ہوگا۔ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ (3:192)۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے اس آیت میں کتنی بڑی حقیقتوں کو بیان کر دیا ہے۔ بہرحال بات یہ ہو رہی تھی کہ قرآن کی رو سے امتِ مسلمہ اور جماعتِ مومنین کا فریضہ یہ ہے کہ وہ کائنات کی ایک ایک چیز کا مشاہدہ کریں اور پیہم تجربات سے ان کے منفعت بخش پہلوؤں کو بے نقاب کرتے جائیں۔ اسی کو قرآن نے ذکر و فکر سے تعبیر کیا ہے یعنی کائناتی قوانین کو اپنے سامنے رکھنا اور ان میں ہر آن غور و تدبیر کرتے رہنا۔ یہی مومنین کا شعار تھا۔ إِنَّ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِينَ (45:3)۔ مومنین کے لئے کائنات کے ہر گوشے میں آیاتِ خداوندی بکھری پڑی ہیں۔ انہی سے انسان کو خدا کی خداوندی کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِن دَابَّةٍ آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ (45:4)۔ اور خود تمہاری تخلیق اور دوسرے حیوانات کی افزائشِ نسل میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو قانونِ خداوندی پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن رِّزْقٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ آيَاتٌ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (45:5)۔ اور رات اور دن کی گردش میں، اور اس بارش میں جو بادلوں سے برستی ہے اور ہر جاندار کے لئے اپنے اندر نشوونما کا سامان رکھتی ہے اور جو زمین مردہ کو ازسرِ نو زندگی عطا کرتی ہے۔ اور ان ہواؤں میں جو مختلف موسموں میں مختلف سمتوں میں چلتی ہیں۔ ان تمام مظاہرِ فطرت میں اس قوم کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتی ہے۔ ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد، قرآن ایک ایسی عظیم حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ جس سے بیک وقت حیرت و بصیرت پیدا ہو جاتی ہے۔ فرمایا: تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۔ یہ وہ آیات ہیں جنہیں ہم حق کے ساتھ تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ اللَّهِ وَآيَاتِهِ يُؤْمِنُونَ (45:6)۔ سو جو لوگ اللہ اور اس کی اس قسم کی آیات پر بھی ایمان نہیں لاتے تو پھر ان کے سامنے اور کون سی حقیقت ایسی آئے گی جس کی رو سے وہ خدا پر ایمان لائیں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے لئے مظاہر

قدرت کا مشاہدہ اور اس کے کائناتی قوانین کا مطالعہ کرو۔ اگر کسی کو ان کے ذریعے بھی خدا پر ایمان حاصل نہیں ہوتا تو پھر کوئی اور حقیقیت ایسی نہیں رہ جاتی۔ جس سے اسے ایمان نصیب ہو سکے۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن مشاہدہ کائنات اور مطالعۂ فطرت پر کس قدر زور دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ صحیح اور علیٰ وجہ البصیرت ایمان حاصل ہی اس سے ہوتا ہے۔ اس سے ''خدا بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔''

میں نے جو یہ کہا ہے کہ اس سے ''خدا بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتا ہے'' تو یہ محض شاعری نہیں کی۔ یہ قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے۔ ایک آیت کا نہیں۔ متعدد آیات میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔ ذرا کان کھول کر سنو اور سوچو کہ قرآن نے چند الفاظ میں کتنی بڑی حقیقت کو سمٹا کر رکھ دیا ہے۔

لِقاءِ رَب

انسانی زندگی کا منتہیٰ کیا ہے؟ ایک خدا پرست انسان کی آخری آرزو کیا ہو سکتی ہے؟ احکامِ خداوندی کی پابندی سے انتہائی مقصود کیا ہے؟ ان سوالات کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ ہر خدا پرست کی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اسے خدا مل جائے۔ اس کی اپنے رب سے ملاقات ہو جائے۔ اب دیکھو سلیم! قرآن اس کے لئے کیا طریق بتاتا ہے' سورۂ رعد میں ہے: اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمَاوَاتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ۔ اللہ کی ذات وہ ہے جس نے ایسے ایسے عظیم کروّں کو فضا کی بلندیوں میں بغیر کسی ایسے ستون کے جو تمہیں نظر آئے' اس حسن و خوبی سے اٹھا رکھا ہے' ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۔ اور وہ خدا اس تمام کائنات کے مرکزی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں رکھے ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ: وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِیْ لِأَجَلٍ مُّسَمًّی ۔ اس نے چاند اور سورج کو اپنے قانون کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ وہ مقرر کردہ راستوں پر ایک وقت معین تک کے لئے بلا چوں و چرا چلے جا رہے ہیں يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۔ وہ خدا اپنے اس پروگرام کو حسنِ تدابیر سے چلائے جا رہا ہے يُفَصِّلُ الْآيَاتِ ۔ اور اپنی ان آیات کو تمہارے لئے کھول کھول کر بیان کرتا ہے لَعَلَّكُم بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ (13:2)- تا کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا پورا پورا یقین کرو۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے یہاں کیا کہا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ نظام کائنات کے متعلق یہ تمام تفصیلات اس لئے بیان کی جاتی ہیں کہ تمہیں اس بات کا یقین آ جائے کہ تم اپنے رب سے مل سکتے ہو۔ تمہارا رب تمہارے سامنے آ سکتا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ اگر تم اپنے رب کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم نظامِ کائنات کا مطالعہ کرو۔ ایک ایک شے پر غور و فکر کرو۔ مختلف تجربات سے اس حقیقت کا

انکشاف کرو کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات کس محکم قانون کے مطابق چل رہا ہے۔ اس طرح وہ تمام پردے ایک ایک کر کے اٹھ جائیں گے جو خدا کے نظامِ ربوبیت کو سطح بین نگاہوں سے چھپائے رکھتے ہیں اور تم علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لو گے کہ اس کا قانون رب العالمینی کس طرح کائنات کی نشوونما کئے جا رہا ہے۔ اس طرح تم اپنے رب کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لو گے۔ اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے اسے آنکھوں سے دیکھ لینا تو ایک طرف' اس کا تصور بھی ذہن انسانی میں نہیں آ سکتا۔ **لَّا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (6:103)**- انسانی نگاہیں اسے پا ہی نہیں سکتیں۔ اس لئے ''لقاء رب'' کے یہ معنی نہیں کہ خدا کی ذات بے نقاب ہو کر انسان کے سامنے آ سکتی ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ فطرت کے مشاہدے سے خدا کا نظام ربوبیت انسان کے سامنے بے نقاب ہو کر آ جاتا ہے اور وہ اس کی رب العالمینی کی کارفرمائیوں اور کرشمہ سازیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ بہرحال یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کی رو سے ''لقاء رب'' کا یقین انہی کو آ سکتا ہے جو فطرت کا مشاہدہ کریں لیکن اس کے لئے بڑی جدوجہد درکار ہوتی ہے۔ پیہم سعی وعمل اور مسلسل تگ وتاز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے کبھی ہمالیہ کی چوٹیوں پر چڑھنا پڑتا ہے اور کبھی بحرِ اٹلانٹک کی گہرائیوں میں اترنا۔ کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں جھلسنا پڑتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو سانپوں سے ڈسوانا۔ کبھی ایک پتے کی تحقیق میں مہینوں وقفِ فکر وتدبر رہنا پڑتا ہے اور کبھی قطب شمالی کے برف پوش میدانوں میں ٹھٹھرنا۔ کبھی شیروں کے منہ میں ہاتھ دینا پڑتا ہے اور کبھی ایک جرثومہ کی تشریح میں برسوں محوِ مطالعہ ومشاہدہ۔ اور ظاہر ہے یہ کچھ وہی قومیں کر سکتی ہیں جو حاضر وموجود پر مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں بلکہ مستقبل کی فکر میں غلطاں وپیچاں رہیں۔

متقی کون ہے

دیکھو سلیم! قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر واضح الفاظ میں بیان کیا ہے' ارشاد ہے: **اِنَّ فِیْ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ فِی السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیَاتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ (10:6)**- یقیناً دن اور رات کی گردش اور کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے۔ اس کی تخلیق میں تقویٰ شعار قوم کے لئے خدا کی آیات ہیں۔ ضمناً تم نے غور کیا سلیم! کہ خدا نے متقیوں کی کیا علامت بتائی ہے؟ اس کے بعد ہے: **اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَاءَ نَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (10:7)**- اس کے برعکس جو لوگ 'ہماری ملاقات' کی توقع نہیں رکھتے۔ جن کے دل میں اس کی آرزو موجزن نہیں ہوتی۔ یعنی وہ لوگ جو پیش پا افتادہ مفاد' حال کی قریبی زندگی پر راضی ہو

جاتے ہیں۔ وَاطْمَأَنُّواْ بِهَا ۔اور جو کچھ سامنے پڑا ہو اسی پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ (10:7)۔یعنی وہ لوگ جو ہماری ان کائناتی نشانیوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ أُوْلَئِكَ مَاوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُواْ يَكْسِبُونَ (10:8)- یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال کی بدولت جہنم کے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔ پہلے تو اس بات پر غور کرو سلیم! کہ قرآن کریم نے رضوا بالحیوٰۃ الدنیا اور واطمانوا بھا سے کتنی بڑی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے۔ دنیا میں قوموں کی نکبت و زبوں حالی اور عروج و اقبال کا بنیادی راز کیا ہے؟ کیا یہی نہیں کہ ایسی قومیں جو اس پر شاکر اور قانع ہو کر بیٹھ جائیں جو انہیں آسانی سے میسر آ رہا ہو۔ وہ ندرتِ فکر اور قوتِ عمل سے محروم ہو کر ذِلت و پستی کے عمیق گڑھوں میں جا گرتی ہیں اور زندہ قوموں کی صفوں سے کہیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ ان کے برعکس جو قومیں حاضر و موجود پر قانع نہیں رہتیں۔ بلکہ مسلسل محنت و مشقت سے نت نئی ایجادات اور نت نئے انکشافات کرتی رہتی ہیں وہ مصارفِ زندگی میں کہیں آگے نکل جاتی ہیں۔ یہ وہ قومیں ہیں جو خدا کے نظامِ ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھنے کے نشہ میں سرشار ہوتی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ آسمان ان پر اپنی قوتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ زمین اپنے چھپے ہوئے خزانے ان کے حوالے کر دیتی ہے۔ جو قومیں ایسا نہیں کرتیں وہ اس سامانِ ربوبیت سے محروم رہ جاتی ہیں۔

سامانِ ربوبیت سے محرومی

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللّهِ وَلِقَائِهِ أُوْلَئِكَ يَئِسُوا مِن رَّحْمَتِيْ۔ جو لوگ ان آیاتِ خداوندی اور ملاقاتِ ربی سے انکار کرتے ہیں وہ خدا کے عطا فرمودہ سامان نشوارتقاء سے محروم رہ جاتے ہیں۔ وَأُوْلَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ (29:23)- یعنی یہ لوگ ایک دردانگیز عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تم نے دیکھا سلیم! خدا کے سامانِ رحمت و ربوبیت سے محرومی کو قرآن نے عذابِ الیم کہا ہے۔ اسی کو سورۂ آل عمران اور سورۂ یونس میں عذابِ نار سے تعبیر کیا گیا ہے (3:191 ، 10:8 یہ آیات پہلے لکھی جا چکی ہیں) ذرا سوچو کہ حجاز کے بے برگ و گیاہ صحرا کے نیچے ذہب سیال (Liquid Gold) یعنی پٹرول کے دریا صدیوں سے بہہ رہے تھے لیکن چونکہ وہ لوگ حاضر و موجود پر مطمئن تھے اس لئے وہ اس بیش بہا نعمتِ خداوندی کی نفع بخشیوں سے محروم تھے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ وہ لوگ نانِ شبینہ تک کے لئے دوسروں کی خیرات کے محتاج تھے۔ یہ خدا کا بہت بڑا عذاب تھا [قرآن نے بھوک کو خدا کا عذاب کہا ہے: فَأَذَاقَهَا اللّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ (16:112)] اب اقوامِ مغرب کی نگاہِ خارا شگاف نے ''پگھلے ہوئے سونے'' کے

ان دریاؤں کا سراغ پا لیا اور اپنی مسلسل کوہ کنی سے انہیں کھینچ کر باہر لے آئے۔ اس سے حجاز کا نقشہ بدل گیا۔ خود ہمارے خطۂ زمین (پاکستان) میں فطرت نے ممکنات (Potentialities) کی ایک دنیا چھپا رکھی ہے لیکن ہم چونکہ حاضر و موجود پر مطمئن ہیں اور میسرہ (جو کچھ محنت کے بغیر حاصل ہو جائے) پر شاکر اور قانع۔ اس لئے روٹی تک کے لئے بھی دوسروں کے محتاج ہیں۔ یورپ کی بعض قوموں کے پاس چپہ چپہ بھر زمین ہے لیکن وہ اسی زمین سے اتنا کچھ پیدا کرتے ہیں کہ اپنی ضروریات پورا کرنے کے بعد دوسرے ملکوں کو بھی سامانِ زیست بھیجتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ فطرت کے مخفی خزانوں کو بے نقاب دیکھنے کے لئے مصروفِ سعی و عمل رہتے ہیں۔ ہم نے اس قانونِ خداوندی سے صدیوں سے اعراض برت رکھا ہے اس لئے ہم پر ہماری معیشت تنگ ہو رہی ہے: وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِيْ فَإِنَّ لَهُ مَعِيْشَةً ضَنكاً (20:124)- خدا کا کھلا ہوا فیصلہ ہے جو کسی کی خاطر بدل نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ مدتِ دراز سے اپنے سمع و بصر سے کام نہ لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری یہ صلاحیتیں ہی سلب ہو چکی ہیں اور ہمارا شمار ان لوگوں میں ہو چکا ہے جن کے متعلق ارشاد ہے کہ: أُولَـئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ وَاُوْلَـئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (16:108)- یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب اور سمع و بصر پر مہریں لگ چکی ہیں۔ یہ لوگ ہماری آیات سے بالکل بے خبر ہیں۔

بعض کے نزدیک ''لقاء رب'' سے مراد یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد اپنے اعمال کی جزا و سزا کے لئے خدا کے سامنے جائے گا اگرچہ سیاق و سباق کے پیشِ نظر یہ مفہوم زیادہ موزوں نہیں لیکن اگر اسے بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ قرآن کی رو سے اس ''لقاء رب'' کے یقین کے لئے کائنات میں آیات اللہ کا مشاہدہ اور مطالعہ ضروری ہے۔ مرنے کے بعد کی زندگی اور سزا اور جزا ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن کس طرح مختلف انداز سے اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ:

(1) علم وہی علم ہے جس میں انسان اپنے حواس سے پورا پورا کام لے۔

(2) حواس سے کام لینے سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اس محسوس کائنات کے اسرار و غوامض سے پردہ کشائی کرے۔ اشیائے فطرت کا وسیع مشاہدہ کرے۔ قوانینِ فطرت کا گہرا مطالعہ کرے اور مسلسل تجربات اور پیہم تگ و تاز سے خدا کے نظام و قوانینِ ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھتا چلا جائے۔

(3) قومِ مومنین کا یہی شعار ہے۔ گروہِ متقین کا یہی فریضہ ہے، یہی خدا کا ذکر ہے۔ اس فکر سے چھپی ہوئی حقیقتیں ابھر

کر سامنے آ جاتی ہیں اور انسان کائنات کی ایک ایک شے کے متعلق علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتا ہے کہ: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلاً (3:191)-

قرآنی صداقت کی شہادت

اتنا ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ خود قرآن کی صداقت کی شہادت بھی انہی کائناتی آیات سے ملتی ہے۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)- ہم انہیں اپنی آیات' عالمِ آفاق اور عالمِ انفس میں دکھائیں گے تا آنکہ یہ بات ان کے سامنے ابھر کر آ جائے کہ قرآن فی الواقعہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ یعنی زمانے کے پیچ وخم میں لپٹے ہوئے حقائق جوں جوں انسانی علم وکاوش کے ہاتھوں کھلتے جائیں گے۔ قرآن کے دعاوی کے ثبوت' ایک ایک کر کے سامنے آتے جائیں گے۔ جوں جوں زمانہ مشاہدات فطرت اور علومِ سائنس میں آگے بڑھتا جائے گا قرآنی حقائق بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے۔ اس آیت میں قرآن نے خارجی کائنات (آفاق) کے ساتھ خود انسانی دنیا (انفس) کو شامل کر کے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ سائنس کا تعلق صرف طبیعات (Physics) ہی سے نہیں بلکہ انسانی زندگی سے متعلق جس قدر علوم ہیں۔ وہ بھی اس کے دائرے کے اندر آ جاتے ہیں۔ لیکن ان علوم کے متعلق محض نظری بحثیں مطلوب نہیں بلکہ ان کی تحقیق بھی عملی مشاہدات اور تجارب کی رو سے کی جائے گی تاریخ عمرانیات (Socialogy) اور عملی سائیکلوجی کو اس باب میں خاص اہمیت حاصل ہوگی۔ طبعی سائنس اور انسانی زندگی سے متعلق علوم کی رو سے جوں جوں حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ قرآن کی پیش کردہ صداقتوں کی دلیلیں سامنے آتی جائیں گی۔ یہ اس لئے کہ: أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (41:53)- قرآن اس خدا کی کتاب ہے جس کی نگاہوں سے کوئی راز مستور نہیں۔ اس کے سامنے کائنات کی ہر شے بے نقاب رکھی ہے۔ وہ ہر شے کا ہر وقت مشاہدہ کرتا رہتا ہے اور یہ اس امر کی کافی دلیل ہے کہ وہ ان اشیاء کے متعلق جو کچھ کہے گا ٹھیک کہے گا اس کا بیان علم وحقیقت پر مبنی ہوگا ظن وقیاس پر نہیں۔ اس لئے کہ: أَنزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (25:6)- قرآن اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو کائنات کے تمام رموز واسرار سے واقف ہے لیکن جو لوگ کائنات کی ان آیات سے بے خبر رہتے ہیں۔ انہیں درحقیقت ''لقاءِ رب'' کا یقین نہیں ہوتا۔ أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَاءِ رَبِّهِمْ (41:54)- حالانکہ انہیں اس کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی شے کی بھی ریسرچ شروع کر دیں تو انہیں خدا کا قانونِ ربوبیت جھلمل جھلمل کرتا نظر آ جائے اس لئے کہ: أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ (41:54)- خدا کا قانونِ ربوبیت ہر شے کو محیط

ہے کسی ایک چیز کے ساتھ ہی وابستہ نہیں۔اس لئے ؎

چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

تمہیں یاد ہو گا سلیم! میں نے تم سے ایک دفعہ ایک بڑی عمدہ کتاب کا ذکر کیا تھا جس کا نام تھا (The Great Design) اس کتاب کا پلان یہ تھا کہ دنیا کے مختلف علوم کے ائمہ فکر و تحقیق کے پاس یہ سوالنامہ بھیجا گیا کہ آپ نے اپنے شعبۂ علم میں جس قدر تحقیق کی ہے۔کیا اس کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نظام کائنات کسی خاص نظم و ضبط کے مطابق چل رہا ہے یا یونہی ہنگامی طور پر وجود میں آ گیا اور ہنگامی طور پر چلے جا رہا ہے؟ اس سوال کے جو جوابات ان بڑے بڑے سائنسدانوں کی طرف سے موصول ہوئے انہیں بلا تنقید و تبصرہ محولہ صدر کتاب میں یکجا جمع کر دیا گیا ہے۔ان جوابات کا احاطہ کس قدر وسیع تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ ایک عالمِ نباتیات کے مقالہ کا عنوان تھا ''ایک سبز پتہ'' اور غالباً سر جیمز جنس نے ''ستاروں کی گذرگاہیں'' کے عنوان سے جواب لکھا تھا۔ ان میں ہر محقق اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ہمیں کائنات کے ذرے ذرے میں کسی علیم و حکیم کے مستحکم اور غیر متبدل نظم و نسق کی کارفرمائیاں دکھائی دیتی ہیں۔کائناتی نظم و ضبط کی یہی وہ کارفرمائیاں ہیں۔جن کے سامنے ان ائمہ فکر و تحقیق کی نگہ عقیدت قدم قدم پر جھک جاتی ہے لیکن چونکہ ان کے سامنے قرآن نہیں۔اس لئے وہ اس ہستی کے متعلق صحیح صحیح تصور کا اندازہ نہیں لگا سکتے جو اس نظام کو بایں حسن و رعنائی چلا رہی ہے۔بایں ہمہ وہ اس کے نظامِ ربوبیت کبریٰ کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر رہے ہیں (ان کے لئے اس مقام سے قرآن تک پہنچ جانا کچھ دشوار نہیں بشرطیکہ کوئی ان کے سامنے قرآن کو پیش کرنے والا ہو)۔

علماء کون ہیں؟

یہاں تک تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ قرآن کی رو سے علم کی تعریف کیا ہے۔اس کے بعد اس نقطہ کی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ قرآن کی رو سے عالم کسے کہتے ہیں اور علماء سے مراد کون لوگ ہیں لیکن قرآنِ کریم کا اعجاز دیکھو کہ اس نے اس حقیقت کو بھی خود ہی واضح کر دیا ہے تا کہ اس باب میں کسی قسم کا شبہ یا ابہام نہ رہے۔قرآن میں ''علماء'' کا لفظ صرف دو مقامات پر آیا ہے۔ایک جگہ سورۂ شعراء (26:98) میں جہاں علمائے بنی اسرائیل کا ذکر ہے اور دوسری جگہ سورۂ فاطر میں جہاں ''خدا کے بندوں میں سے علماء'' کا ذکر ہے۔اس تذکرہ کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے: اَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفاً أَلْوَانُهَا۔کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ کا قانون کس طرح بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں' وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ

مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهَا وَغَرَابِيۡبُ سُوۡدٌ ۔اور پہاڑوں میں کس کس انداز کے سرخ وسفید طبقے ہیں جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں اوران میں بعض گہرے سیاہ رنگ کے ہیں' وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالۡاَنۡعَامِ مُخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۔اوراسی طرح انسانوں اوردیگر جانداروں اور مویشیوں کی بھی مختلف اقسام ہیں۔تم نے دیکھا سلیم! کہ ان آیات میں کن امور کا ذکر ہو رہا ہے۔کائنات کے مختلف گوشوں کا۔ بساطِ فطرت کے متنوع شعبوں کا۔سائنس کے مختلف علوم کا۔طبیعات (Physics)' نباتیات (Botany)' طبقات الارض (Geology)' حیوانیات (Zoology) اورانسانیات کے تمام شعبے اس کے اندر آ جاتے ہیں۔ان علوم وفنون کے تذکرہ کے بعد ہے:اِنَّمَا يَخۡشَى اللّٰهَ مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُلَمٰٓؤُا ۔حقیقت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں سے علماء ہی وہ ہیں جن کے دل پر اس کی عظمت اور ہیبت چھا جاتی ہے'اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ غَفُوۡرٌ (35:27-28)- کیونکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے اور کس طرح ایسے عظیم کارگۂ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر آگے بڑھائے جا رہا ہے۔تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے علماء کا لفظ کن لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے؟ انہیں کے لئے جنہیں ہم آج کی اصطلاح میں سائنٹسٹ اور کائناتی مفکر کہتے ہیں۔وہ لوگ جو کائناتی نظام کا مطالعہ کرتے اور مسلسل مشاہدات و تجربات کے بعد فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ خدا نے فطرت کی تمام قوتیں ہمارے لئے مسخر کر رکھی ہیں (وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض) لیکن ان قوتوں کو اپنے کنٹرول میں وہی لا سکتا ہے جو ان قوانین سے واقف ہو جن کے مطابق یہ قوتیں کام کرتی ہیں۔یہ قوانین فطرت کے مشاہدہ اور مطالعہ اور پیہم تجربات سے معلوم ہو سکتے ہیں جو لوگ ان قوانین کا علم حاصل کرتے ہیں انہیں قرآن علماء کہہ کر پکارتا ہے۔

ہمارے علماء

علماء کی اس قرآنی تعریف (Definition) کے بعد تم غور کرو سلیم! کہ ہمارے ہاں جو حضرات علماء کہلاتے ہیں انہیں علم الفطرت (سائنس کے علوم) سے کس قدر تعلق ہوتا ہے۔وہ علم الفطرت کے مبادیات تک سے واقف نہیں ہوتے۔ان کا علم نظری مباحث اور لفظی کتر بیونت سے ایک قدم آگے نہیں جاتا اور یہ نظری مباحث بھی ان مسائل سے متعلق ہوتے ہیں جنہیں نہ کائنات سے کچھ تعلق ہوتا ہے نہ انسان کی عملی زندگی سے کچھ واسطہ۔ ہمارے مذہبی مدارس کا نصاب قریب دس سال پر پھیلا ہوا ہوتا ہے۔اس دس سال میں سے بیشتر عرصہ منطق۔فلسفہ۔ معانی۔بیان۔ادب۔نحو وغیرہ کی تحصیل میں صرف ہو جاتا ہے اور منطق وفلسفہ بھی جواب عہدِ پارینہ کی داستان بن چکا

ہے۔اس نصاب میں ہیئت، ہندسہ اور حساب کی بھی دو تین کتابیں ہوتی ہیں لیکن ان میں بھی وہ کچھ پڑھایا جاتا ہے جو زندگی میں کسی کام نہیں آتا اور تو اور (تم حیران ہو گے کہ) ان کے نصاب میں قرآن کریم بھی داخل نہیں۔تفسیر میں جلالین پڑھا دی جاتی ہے جس میں صرف قرآنی الفاظ کے مرادفات دیئے گئے ہیں اور آخری سال سورۂ بقر کی تفسیر بیضاوی۔بس یہ ہے ان کا نصاب جس کی تکمیل کے بعد انہیں عالم ہونے کی سند مل جاتی ہے۔اشیائے فطرت کے متعلق ان حضرات کے علم کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ جب ہندوستان میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال شروع ہوا ہے تو ''علمائے کرام'' سے اس کے جائز اور ناجائز ہونے کے متعلق فتویٰ مانگا گیا۔اس فتویٰ کے جواب میں جمیعتہ العلماء کے صدر مفتی کفایت اللہ مرحوم نے لکھا کہ:

> جس آلہ کے متعلق سوال کیا گیا وہ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔مگر سننے میں آیا ہے کہ وہ ایک ایسا آلہ ہے جسے خطیب یا قاری کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور وہ اس کی طرف رخ کئے ہوئے قرأت یا خطاب کرتا ہے۔پس وہ آلہ آواز کو جذب کر کے اتنی دور نشر کرتا ہے کہ اس کے چوتھائی فاصلہ تک بھی بغیر اس کی مدد کے آواز پہنچانا مشکل ہے۔

(بحوالہ نقیب، 10-11-1941)

اس کے بعد مفتی صاحب نے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا۔لیکن دارالعلوم (دیوبند) کے بہت بڑے مفتی شفیع محمد صاحب مرحوم نے (جو بعد میں پاکستان تشریف لے آئے) اس کے خلاف ان فتاویٰ کا مجموعہ شائع کیا۔جس میں ''عباداتِ مقصورہ'' کے لئے اس آلہ کو حرام قرار دیا گیا تھا *۔انہوں نے اس رسالہ میں (جس کا نام البدائع المفیدہ فی حکم الصنائع الجدیدہ تھا) لکھا تھا کہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس آلہ کی ماہیت کیا ہے اور وہ کس طرح کام کرتا ہے۔اس کے لئے انہوں نے الیگزینڈر ہائی سکول بھوپال کے سائنس ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت فرمایا۔انہوں نے کہا کہ:

> برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم از کم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصلی آواز ہے اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے۔

چنانچہ اس تحقیقِ انیق کے بعد مفتی صاحب نے عبادات کے لئے لاؤڈ سپیکر کے استعمال کو حرام قرار دے دیا۔یعنی ماسٹر برج نندن لال صاحب کی بات کی بنیاد پر یہ فیصلہ فرمایا کہ خدا اور رسول ﷺ کا اس باب میں یہ حکم ہے۔تم نے غور کیا سلیم! کہ اشیائے فطرت کی تحقیقات اور علومِ جدیدہ کے متعلق ان حضرات کی معلومات کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ان چیزوں کے متعلق ان کی معلومات کا تو یہ عالم ہوتا ہے لیکن یہ ان کے حرام و حلال ہونے کے متعلق فتوے صادر ضرور کرتے رہتے ہیں اور اب پاکستان میں معاملہ فتاویٰ کی حد

سے بڑھ کر قانون سازی تک پہنچ گیا ہے۔ مثلاً اگر اب یہ معاملہ حکومت کے سامنے آ جائے کہ خطبات کے لئے لاؤڈ سپیکر کا استعمال جائز ہے یا ناجائز۔ اور اس کے لئے کسی قانون کے وضع کرنے کی ضرورت ہو تو ان حضرات کا مطالبہ ہے کہ یہ قانون یہ حضرات مرتب کریں گے۔ یعنی یہ حضرات پہلے (کسی) ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت کریں گے کہ لاؤڈ سپیکر ہوتا کیا ہے اور اس کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کی بناء پر اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ اس کا استعمال از روئے کتاب وسنت جائز ہے یا ناجائز اور یہ فیصلہ مملکت کے قانون کی حیثیت سے ملک میں نافذ ہوگا یہ حضرات سب سے زیادہ زور اس بات پر دیتے ہیں کہ اگر ہم نہ ہوں تو لوگوں کو شریعت کے مسائل کون بتائے۔ سو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اسلامی مملکت میں شریعت کے مسائل اس مملکت کے قوانین سے الگ کچھ نہیں ہوتے۔ لہٰذا ان کے بتانے کے لئے کسی خاص گروہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ یہ کام حکومت کا ہوتا ہے نہ کہ مولوی صاحبان کا جب رسول اللہ ﷺ اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں اسلامی مملکت قائم تھی تو اس وقت مولویوں کی کوئی جماعت نہ تھی۔ یہ سب بعد کے زمانہ کی پیداوار ہیں۔ اس وقت تو یہ لفظ (مولوی) ہی کبھی سننے میں نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

ان تصریحات سے تم نے دیکھ لیا ہوگا سلیم! کہ قرآنِ کریم کی رو سے مومنین متقین۔ خدا کا ذکر کرنے والے۔ ''لقاءِ رب'' کی آرزو اور یقین رکھنے والے وہی ہیں جو کائناتی نظام پر غور وفکر کرتے اور اشیائے فطرت کی تحقیقات (ریسرچ) کے لئے عملی جدوجہد کرتے ہیں۔ اسی کا نام قرآن کی رو سے علم ہے اور اسی علم کے حاملین کو وہ علماء قرار دیتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس مقام پر تمہارے دل میں یقیناً یہ خیال پیدا ہو گا کہ اس بناء پر تو یورپ کی قومیں صحیح معنوں میں مومن اور متقی ہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ جماعت مومنین اور گروہِ متقین کے لئے علم الفطرت کی تحصیل نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہر وہ قوم جو علم الفطرت حاصل کر لے مومن اور متقی ہو جاتی ہے۔ یہ فرق اہم ہونے کے ساتھ ذرا باریک بھی ہے اس لئے اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مومن ومتقی وہ ہیں جو تسخیرِ فطرت کے بعد' فطرت کی قوتوں کو ان قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرتے ہیں جو قرآن میں درج ہیں۔ مومن اور متقی ہونے کے لئے یہ دونوں شرطیں ناگزیر ہیں یعنی:

(1) تسخیرِ فطرت اور

(2) اس کے ماحصل کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔

اگر کسی قوم میں ان دو شرطوں میں سے کسی ایک

شرط کی بھی کمی ہے تو وہ قوم مومن اور متقی نہیں ہوسکتی۔ قرآن **ادْخُلُواْ فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (2:208)**- کا حکم دیتا ہے۔ یعنی قرآن کے پورے کے پورے نظام کو اپنے اوپر وارد کرنے کا حکم۔ ہم صحیح معنوں میں مومن اور متقی نہیں کیونکہ ہم میں شرطِ اول (تسخیرِ فطرت) کی کمی ہے۔ (اور جب ہم شرطِ اول (تسخیر فطرت) ہی پوری نہیں کرتے تو شرطِ دوم (قوائے فطرت کا قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنے) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اقوام مغرب مومن اور متقی نہیں کیونکہ ان میں شرطِ دوم کی کمی ہے۔ لہٰذا ایمان وتقویٰ کی عملی سطح پر وہ اور ہم دونوں یکساں ہیں لیکن وہ قومیں اس اعتبار سے ہم سے آگے ہیں کہ انہوں نے تسخیرِ فطرت سے اپنی طبعی زندگی کو خوشگوار بنا لیا ہے اور ہم روٹی تک کے لئے ان کے محتاج ہیں۔

قوائے فطرت کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کے لئے قرآن کے علم کی ضرورت ہے کیونکہ یہ قوانینِ خداوندی قرآن کے اندر ہیں۔ یہی وہ **اَلرَّاسِخُونَ فِيْ الْعِلْمِ (3:7)**- ہیں جو قرآن پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں اور تمام امور کے فیصلے اسی کے مطابق کرتے ہیں کہ: **مَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (5:44)**- جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں۔ اس کفر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ دولت اور رزق کی فراوانی کے باوجود جہنم بن جاتا ہے (جیسا کہ اس وقت یورپ کا حشر ہو رہا ہے) وہ لوگ سائنس کا اس قدر وسیع علم رکھنے کے باوجود انسانی زندگی کے معاملات کا صحیح حل دریافت نہیں کر پاتے۔ یعنی اس باب میں ان کا سمع وبصر وفوأد انہیں کچھ کام نہیں دے رہا۔ قرآن کریم نے ایسی ہی قوموں کے متعلق کہا ہے کہ: **وَلَقَدْ مَكَّنَّاهُمْ فِيْمَا اِن مَّكَّنَّاكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعاً وَاَبْصَاراً وَاَفْئِدَةً** ۔ ہم نے ان قوموں کو دنیا میں اس قدر تمکن عطا کیا تھا کہ تمہیں بھی ایسا تمکن عطا نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں سمع وبصر وفوأد بھی عطا کیا تھا۔ لیکن **فَمَا اَغْنَى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا اَبْصَارُهُمْ وَلَا اَفْئِدَتُهُم مِّن شَيْءٍ اِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ (46:26)**- لیکن جب انہوں نے ان قوانین خداوندی کی صداقت سے انکار کیا جو رسولوں کی وساطت سے انہیں ملے تھے تو ان کی سمع وبصر وفوأد انہیں تباہی سے نہ بچا سکے۔ یہ تمام علم ان کے کسی کام نہ آ سکا۔ اگر یہ لوگ کائنات کی قوتوں اور فطرت کی بخششوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کریں تو وہ جہنم جس میں دنیا اس وقت مبتلا ہے اس جنت میں تبدیل ہو جائے۔ جس کی تلاش میں انسانیت ماری ماری پھر رہی ہے۔ دیکھو سلیم! اس حقیقت کو قرآن کیسے حسین انداز میں بیان کرتا ہے۔ تم سورۂ یونس کی ان آیات کو پھر اپنے سامنے لاؤ۔ جن میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ کائنات میں غور وفکر سے خدا کے

نظامِ ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب نہیں دیکھنا چاہتے اور جو کچھ انہیں یونہی میسر آ جاتا ہے۔ اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ مَأْوَاھُمُ النَّارُ (10:8)- یہ لوگ جہنم میں رہتے ہیں۔ اس کے بعد ہے: اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (10:9)- جو لوگ ان کے برعکس آیاتِ خداوندی پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے بتائے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ یَھْدِیْھِمْ رَبُّھُمْ بِاِیْمَانِھِمْ (10:9)- ان کا نشوونما دینے والا ان کے اس ایمان کی بناء پر زندگی کے صحیح نقشوں کی طرف ان کی راہ نمائی کر دیتا ہے۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھِمُ الْاَنْھٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ (10:9)- جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خوشگواریوں کے ان باغات میں رہتے ہیں۔ جن کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آتا۔ دَعْوٰھُمْ فِیْھَا سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ (10:10)- اس جنتی معاشرہ کو دیکھ کر ان کے لب پر بے ساختہ یہ پکار آ جاتی ہے کہ بارالٰہا! فی الواقعہ یہ بات تجھ سے بہت بعید تھی کہ تو اس کائنات کو باطل پیدا کر دیتا۔ وَتَحِیَّتُھُمْ فِیْھَا سَلٰمٌ (10:10)- اور اس معاشرہ میں ان کی ایک دوسرے کے متعلق آرزوئیں بڑی ہی حیات بخش اور سلامتی افروز ہوتی ہیں۔ جن لوگوں نے اس معاشرہ کو قائم کیا وہ مسلسل جدوجہد اور پیہم سعی وعمل سے اس کی حدود کو وسیع سے وسیع تر کرتے جائیں گے۔ تا آنکہ آخرالامر یہ تمام نوعِ انسانی کو محیط ہو جائے گا۔ ہر دیکھنے والا پکار اٹھے گا کہ خدا کا یہ نظامِ ربوبیت کس طرح ہر قسم کی حمد وستائش کا سزاوار ہے: وَآخِرُ دَعْوٰھُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (10:10)- یہ نتیجہ ہوتا ہے فطرت کی نعمتوں کو خدا کے قانون کے مطابق صرف اور تقسیم کرنے کا۔

حرفِ آخر

ان تصریحات سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آ گئی ہو گی سلیم! کہ اگر ہم اپنے معاشرہ کو قرآنی خطوط پر تشکل کرنا چاہیں تو اس کے لئے ضروری ہو گا کہ ہم اس قسم کے ریسرچ سکالرز اور سائنسدان (Scientists) پیدا کریں جو انفس وآفاق کے ہر شعبے میں قوانینِ فطرت کے مشاہدات وتجربات سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے جائیں اور اس کے ساتھ وہ قوانینِ خداوندی جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں اس طرح عام کئے جائیں کہ فطرت کی ان قوتوں کو ان قوانین کے مطابق تقسیم اور استعمال کرنے میں کوئی دِقّت نہ ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن کی رو سے عُلَمَاء کہا جائے گا۔ جب تک ''علم اور علماء'' کے متعلق ہمارا موجودہ تصور نہیں بدلتا خدا تک پہنچنا تو ایک طرف، ہم زندہ قوموں کے زمرے میں بھی شامل نہیں ہو سکتے ؎

بآدمے نرسیدی خدا چہ می جوئی

وفیھا ایات لقوم یعقلون O

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب المراسلات

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! ماہنامہ طلوع اسلام لاہور۔

السلام علیکم! آپ کے موقر جریدے کے جون 2010ء کے شمارے میں ''فتویٰ کی حقیقت'' کے عنوان سے ایک بہت اچھا مضمون شائع ہوا تھا جس میں لندن (ریڈیو رپورٹ) کے حوالے سے 3-1-2001 کے روزنامہ جنگ لاہور میں چھپنے والی ایک نہایت اہم خبر لفظ بلفظ نقل کی گئی تھی جس کے مطابق بنگلہ دیش ہائی کورٹ نے ایک فیصلے کے تحت علماء کے جاری کردہ فتوے غیر قانونی قرار دے دیئے اور عدالت نے پارلیمنٹ سے کہا کہ ایسا قانون بنایا جائے کہ فتوے جاری کرنا قابلِ دست اندازی پولیس فعل بن جائے۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق' ''ایوان جمہور'' 107' ٹیپو بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور کے ماہنامہ جہدِ حق کے اگست 2010ء کے شمارے میں ایک اور اہم خبر شائع ہوئی ہے جسے بشکریہ ماہنامہ جہدِ حق عوام کی واقفیت کے لئے لفظ بلفظ نیچے نقل کیا جا رہا ہے:

''ڈھاکہ ہائی کورٹ نے فتویٰ کے تحت دی گئی سزا کو غیر قانونی قرار دے دیا''

(ڈھاکہ) 8 جولائی ڈھاکہ ہائی کورٹ نے ''فتوی'' کے تحت دی جانے والی کسی بھی ماورائے عدالت سزا کو غیر قانونی قرار دے دیا۔

مفادِ عامہ میں مقدمے بازی کے تحت دائر کی جانے والی رٹ پٹیشن کی سماعت کے بعد صادر کردہ اپنے فیصلے میں عدالت عالیہ کے ایک ڈویژن بینچ نے ہر اس فرد کو مجرم قرار دیا جو ماورائے عدالت سزا سنانے کا مرتکب ہوتا ہے۔

بینچ نے حکومت کو ہدایات جاری کیں کہ وہ ایسے جرم کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف مجموعہ تعزیرات (پینل کوڈ) اور دیگر متعلقہ قوانین کے مطابق قانونی کاروائی عمل میں لائے۔۔۔ اور ''فتوی'' کے تحت دی جانے والی سزا کو کالعدم قرار دے دیا۔ عدالتِ عالیہ نے اپنے فیصلے میں اس رائے کا اظہار کیا کہ فتویٰ کے تحت دی جانے والی کوئی بھی ماورائے عدالت سزا آئین اور ملک میں رائج دیگر قوانین کے منافی ہے۔ کوئی بھی شخص جو ایسی

سزا سناتا ہے اور دیگر افراد جو اس کاروائی میں اس کی معاونت کرتے ہیں.....وہ سب مجرم ہیں اور عدالت کے حکم کے مطابق ان سب کو قانون کے مطابق سزا ملنی چاہئے۔

اس سے قبل یکم جنوری 2001ء کو عدالتِ عالیہ نے پہلی بار یہ حکم دیا تھا کہ کوئی بھی ''فتویٰ یا ایسی قانونی رائے جو کسی عدالت نے نہ دی ہو۔۔۔غیر مستند اور غیر قانونی تصور کی جائے گی۔عدالت عالیہ کی رائے کے مطابق ''فتویٰ'' کسی قانونی فرد یا اتھارٹی کی قانونی رائے ہوسکتی ہے.....لیکن بنگلہ دیش کا قانونی نظام صرف عدالتوں کو ہی یہ اختیارات تفویض کرتا ہے کہ وہ مسلم لاء اور دیگر مروجہ قوانین کے حوالے سے تمام سوالات اور مسائل کا فیصلہ کریں۔ بریسٹر چارہ حسین' بیرسٹر محمود شفیق اور ایڈووکیٹ صلاح الدین ڈولن نے پٹیشنرز کی نمائندگی کی (انگریزی سے ترجمہ)

(بشکریہ فری میڈیا فاؤنڈیشن)

23 جنوری 2010ء کو روزنامہ ایکسپریس لاہور میں فتوے کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے ریاض (ای پی پی) کے تحت شائع ہونے والی ایک اہم خبر بھی نیچے درج کی جارہی ہے:

''سعودی علماء کا فتویٰ کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے قواعد وضوابط واضح کرنے کا اعلان''

ریاض (اے پی پی) سعودی اعلیٰ علماء کمیشن نے فتوے کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے قواعد وضوابط واضح کرنے کا اعلان کردیا۔کمیشن کے اعلیٰ رکن شیخ عبداللہ المونی نے کہا ہے کہ 30 جنوری علماء کمیشن کے اجلاس میں فتوے جاری کرنے کے بارے میں یکساں قواعد وضوابط واضح کرنے کے لئے فیصلہ کیا جائے گا۔''

براہِ مہربانی مراسلہ ہذا کو اپنے موقر ماہنامے میں جلد شائع فرما کر شکرگزار فرمائیں۔

آپ کا خیر اندیش

محمد اکرم راٹھور

سانحہ ارتحال

نمائندہ بزم طلوع اسلام منڈی بہاء الدین کی اہلیہ محترمہ 9 اگست کو بوجہ ہارٹ اٹیک وفات پا گئی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر کی توفیق دے۔ادارہ خان محمد صاحب اور ان کے بچوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

پاکستان میں
غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ

کا درس قرآن کریم مندرجہ ذیل منظور شدہ مقامات پر ہوتا ہے

نوٹ: نمائندگان محترم سے التماس ہے کہ ایڈریس یا اوقاتِ درس میں تبدیلی کی صورت میں ادارہ کو فی الفور مطلع فرمائیں۔

شہر	مقام	دن	وقت
ایبٹ آباد	234-KL کیہال۔رابطہ۔گل بہار صاحبہ	بروز جمعہ	10AM
ایبٹ آباد	234-KL کیہال۔رابطہ: شیخ صلاح الدین، فون۔0992-334699، موبائل 0321-9813250	بروز جمعہ	بعد نماز جمعہ
اسلام آباد	برمکان ڈاکٹر انعام الحق، مکان نمبر 302، سٹریٹ نمبر 57، سیکٹر F-11/4 رابطہ: ڈاکٹر انعام الحق، فون نمبر 051-2290900، موبائل: 0333-5489276	بروز اتوار	11AM
اوکاڑہ	برمکان احمد علی، بیت الحمد 4-AB-180، شادمان کالونی، ایم۔اے جناح روڈ، رابطہ میاں احمد علی: 0442-527325، موبائل: 0321-7082673	بروز جمعہ	3PM
بچ کسی	برمطب حکیم احمد دین۔رابطہ فون نمبر:	بروز جمعہ	3PM
جہلم	جنجوعہ ٹاؤن، پوسٹ آفس فوجی ملز، نزد بیکن ہاؤس سکول۔رابطہ فون نمبر:	ہر ماہ پہلی اور آخری اتوار	4PM
چوٹی زیریں	بردوکان لغاری برادرز، زرعی سروس، ڈیرہ غازی خان۔رابطہ: ارشاد احمد لغاری۔موبائل: 0331-8601520	ہر ماہ پہلا اتوار	12 بجے دن
چنیوٹ	W-11/9، گوجر چوک (گنبد والی کوٹھی) سیٹلائیٹ ٹاؤن۔ رابطہ: آفتاب عروج، فون: 047-6331440-6334433۔	بروز جمعہ	بعد نماز جمعہ
حیدرآباد (قاسم آباد)	محترم ایاز حسین انصاری، B-12، حیدرآباد ٹاؤن، فیز نمبر 2، قاسم آباد بالمقابل نسیم نگر آخری بس سٹاپ۔رابطہ فون: 022-654906	بروز جمعہ	بعد نماز عصر
راولپنڈی	فرسٹ فلور، کمرہ نمبر 114، فیضان پلازہ۔کمیٹی چوک۔	بروز جمعہ	4PM
	رابطہ ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ، موبائل: 0331-5035964	بروز اتوار	4PM
راولپنڈی	برمکان امجد محمود، مکان نمبر 14/A، گلی نمبر 4، راہِ طلوع اسلام، جنجوعہ ٹاؤن، اڈیالہ روڈ، نزد جراہی سٹاپ، راولپنڈی۔رابطہ: رہائش: 051-5573299، موبائل: 0322-5081985	بروز اتوار	10AM
خان پور	بمقام مکان حبیب الرحمان، محلہ نظام آباد وارڈ نمبر 9 خان پور، ضلع رحیم یار خان رابطہ: نمائندہ حبیب الرحمٰن۔فون نمبر گھر: 068-5575696، دفتر: 068-5577839	بروز جمعہ	3PM

سیالکوٹ	معرفت کمپیوٹرسٹی، سٹی ہاؤس، سٹی سٹریٹ، شہاب پورہ روڈ، رابطہ: محمد حنیف، 03007158446۔ محمد طاہر بٹ، 0300-8611410۔ محمد آصف مغل 0333-8616286۔ سٹی ہاؤس 052-3256700	ہر دوسرے اتوار	5PM
سرگودھا	B-4، گلی نمبر 7، بلاک 21، نزد مکی مسجد چاندنی چوک، رابطہ۔ ملک محمد اقبال۔ فون: 048-711233	بروز منگل	7PM
فیصل آباد	رحمان نور سینٹر، فرسٹ فلور، مین ڈگلس پورہ بازار، رابطہ: محمد عقیل حیدر، موبائل: 0313-7645065	بروز جمعہ	4PM
فتح پور، سوات	فتح پور، سوات، رابطہ: خورشید انور، فون: 0946600277، موبائل: 0303-8621733	بروز اتوار	3PM
	محترم ظاہر شاہ خان آف علی گرام، سوات کا ڈیرہ۔ موبائل: 0346-9467559	ہر اتوار	9AM
کراچی	105 سی بریز پلازہ، شاہراہ فیصل۔ رابطہ شفیق خالد، فون نمبر: 0300-2487545	بروز اتوار	10AM
کراچی	A-446 کوہِ نور سنٹر، عبداللہ ہارون روڈ، رابطہ محمد اقبال۔ فون 021-35892083، موبائل 0300-2275702	بروز اتوار	10AM
کراچی	ڈبل اسٹوری نمبر 16، گلشن مارکیٹ، کورنگی نمبر 5۔ رابطہ: محمد سرور۔ فون نمبرز: 021-35031379-35046409، موبائل: 0321-2272149	بروز اتوار	2PM
کراچی	نالج اینڈ ویز ڈم سنٹر، سلمان ٹاورز، آفس نمبر C-15، بالمقابل نادرا آفس، ملیر سٹی۔ رابطہ: آصف جلیل فون نمبر: 021-35421511، موبائل: 0333-2121992، محمود الحسن۔ فون: 021-35407331	بروز اتوار	11AM
کوئٹہ	صابر ہومیو فارمیسی توغی روڈ۔ رابطہ فون: 081-825736	بروز اتوار	4PM
گوجرانوالہ	شوکت نرسری، گل روڈ، سول لائنز۔ رابطہ: موبائل: 0345-6507011	بروز جمعہ	بعد نماز عصر
لاہور	B-25، گلبرگ 2، (نزد مین مارکیٹ، مسجد روڈ)۔ رابطہ فون نمبر: 042-35714546	بروز اتوار	10AM
لاڑکانہ	برمکان اللہ بخش شیخ نزد قاسمیہ محلہ جاڑل شاہ، رابطہ فون: 074-4042714	بروز جمعہ	بعد نماز مغرب
منڈی۔۔ بہاؤالدین	رابطہ: خان محمد، (وڈیو کیسٹ) برمکان ماسٹر خان محمد گلی نمبر 1، محلہ صوفی پورہ۔ فون نمبر: 0456-502878	بروز جمعہ	10 AM
نواں کلی، صوابی	رابطہ بابو اسرار اللہ خان، معرفت ہومیو ڈاکٹر ایم۔ فاروق، محلہ خدر خیل۔ فون نمبر:	بروز اتوار	10 AM
صوابی	بمقام چار باغ، (حجرہ ریاض الامین صاحب)، (رابطہ: انچارج یوٹیلیٹی سٹورز، مردان روڈ، صوابی) فون نمبرز: (0938)310262, 250102, 250092	بروز اتوار	3 P.M

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ کی جملہ تصانیف اور ماہنامہ طلوع اسلام کا تازہ شمارہ بھی انہی جگہوں پر دستیاب ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

خریدار حضرات خصوصی توجہ فرمائیں

جن خریدار حضرات کی زرِ شرکت ماہنامہ طلوع اسلام ختم ہو چکی ہے وہ برائے مہربانی جلد از جلد ادارہ کو ارسال فرمائیں۔ شکریہ

Why Do We Celebrate Eid?

Bazm Tolu-e-Islam

LONDON

==========

Every tribe, people or race throughout the world celebrates a festival of one sort or another. Muslims also celebrate some festive occasions on some days of the year. But the festival of Eid is one that we are commanded to celebrate in festivity, joy and happiness by Allah Almighty Himself ! This in itself portrays its importance.

In Surah Yunus it is said:

> *"O mankind! There has come to you indeed an admonition from your Lord and a healing for what is in the hearts; and a guidance and a mercy for the believers. Say: In the grace of Allah and in His mercy, in that they should rejoice. It is better than (all the worldly wealth) that they amass." (10:57-58).*

This is the occasion Muslims have been enjoined by Allah (SWT) Himself to celebrate with happiness and joy. This occasion is called *JASHN-E-NUZOOL-E-QURAN,* i.e. *EID-UL-FITR-DAY.*

The Quran was first bestowed from on high in the month of Ramadaan as a guidance to man (2:185). Therefore the entire month of fasting is, in a way, a preparation for the celebration of this festival day called Eid. The question arises: *what,* after all, has Allah given us for which we are commanded to rejoice? The answer is given by the Quran itself that it (the Quran) makes man aware of his true status in this world. Allah says:

> *"Indeed there has come to you from Allah, a Light and a clear Book." (5:15, 14:1).*

Ponder for a moment what happens in the dark, and what happens to darkness when it is stabbed by light! In darkness, no object, article or a thing's correct identity, position and location can be known; whereas in light every object's true location and identity is before us. In darkness we mistakenly presume a rope to be a snake, and *vice versa.* But when light comes, we see the difference between a rope and a snake!

DARKNESS

Before the revelation of the Holy Quran, man was in utter darkness. He was ignorant of his exalted status in the universe, nor was he aware of the phenomena of nature. In short, he knew very little about the physical world and his own place in it. What kind of darkness was prevalent before the Divine revelation? It was the darkness of thought, of intellect, superstitions, and darkness of heart and mind. It was the darkness of being unacquainted with one's own actual self. And the fact is that this darkness of being unaware of his own true position and dignity was the *sum* of all his darkness: it was the source and fountainhead of his darkness. Had man been aware of his own true self, then he would have eliminated all other darknesses. Thus the question arises as to what dignified position the Quran has given to man? If we seek a detailed answer to the question, then we have to go through the whole Quran. And this is not possible to accomplish within the confines of this short article. We shall touch briefly on a few aspects, but it will not be possible to understand them until it is not seen that before the revelation of the Quran, to what extent was man engulfed in darkness, and to what depth of degradation he had descended.

At the time of the revelation of the Quran, man had enslaved man. In some societies he was in abject bondage. The feudal lord was his god. Monasticism had completely stunted his intellect and senses. Capitalism was sucking the last drop of blood of the working classes like a leech. This was the state of "civilisation" at the time the Quran was revealed.

It declared that the mission of the Prophet Muhammad (S) was to destroy the chains in which mankind has been shackled (7:157). Of these chains, the very first was that of ignorance and superstition. Due to his lowly position, man was afraid of the natural forces. Menacingly dark clouds, eardrum and nerve-shattering thunder, lightning, and the roaring of mighty rivers instilled a terrible fear in his heart. Gale-force winds made him shudder. When he saw huge, sky-embracing mountains, he felt an unspeakable awe. He felt puny and helpless before these awesome powers of nature.

GODS OR GODDESSES

He came to realise that there is some inexplicable power behind each of these phenomena. In order to save and secure himself (in his own mind) from the wrath of such mighty powers, he could think of only one kind of escape: to take these forces as gods or goddesses and bow before

them in worship. He would offer human sacrifices and other oblations to appease these angered deities. This is the position that man had established for himself against these physical forces.

The Quran came and addressed him:

"Seest thou not that Allah has made subservient to you all that is in the earth, and the ships gliding in the sea by His command? And He withholds the heaven from falling on the earth except with His permission. Surely Allah is Compassionate, Merciful to mankind." (22:65, 45:12-13).

Everything is for man's benefit. If you ponder for a moment, think and study the phenomena of nature, then your own standing *vis-à-vis* the universe will be made manifest to you. It will dawn upon you that you are not the subordinate, but the master of all things in the cosmos.

IMMUTABLE LAWS

These forces of nature are governed by predetermined laws made by Allah. These physical laws are unchangeable and permanent in their character and operation (33:62). There should thus be no doubt about the immutability of these laws. They can NEVER change suddenly and elude man's control. Everything acts or happens according to these laws. Man has been given the faculty to understand and acquire the knowledge of these laws. The more he acquires the knowledge of these unchangeable laws of nature, the more they will unfold and continue to unfold as man progresses towards mastering them.

This was the mirror in which he was shown his true identity by Allah (SWT) through the Quran. Thus in one leap he became the Respected Master of all things that bowed down to him in submission. He gained ascendancy over the entire creation.

But the main, challenging obstacle in man's forward march was the tyrannical subjugation of man by man. This cruel, pharaonic idea was so deeply ingrained in the human mind that he came to accept his serfdom as a natural norm and the right to be ruled by his dominating, enslaving masters – a sort of divine "birthright"! The Quran arrived and proclaimed that the right to exercise authority belongs only to Allah. He has enjoined that we should obey none but Him. Further the fundamental principle of *Deen* is that no human being – even though Allah may have given him a code of laws, a revelation (Nubuwwat), or the power to enforce it – has the right to say to others: *"It is not meet for a mortal that Allah should give him the Book and the judgment and the prophethood, then he should say to*

men: Be my servants besides Allah's; but (he would say): Be worshippers of the Lord because you teach the Book and because you study (it)." (3:78-79, 12:40).

It can thus be seen that by this one single declaration, the Quran has destroyed the shackles of all kinds of subjugation. It freed man from every mode and aspect of human slavery and entrenched him with Allah's rule only.

SLAVERY OF MIND

The entire teaching of the Quran is the explanation of this one point alone. The obedience must be to the Laws of Allah only, and not of any man.; (12:40, 18:26). If he allows the rule of any other than Allah, it would be a negation of the very purpose of man's creation.

The sadistic tyranny and domination by brute force could hold a man physically, but there was another kind of slavery that was far worse than the former. This was the slavery of mind and heart, controlled by the so-called "religious leaders", priests, or "ulama", the peers, saints and mystics who claimed to be intercessors between man and God. This class, *vis-à-vis* the pharaonic class, badly wanted to be loved, obeyed, revered and worshipped. They were in fact a god-head. The Holy Quran exposed their machinations and true colours to mankind: that in reality it is all an economic game these little tin gods play with the masses to hide the truth. They wish to live parasitically in luxury on the earnings of others and do nothing themselves. The fact is that the majority of them never earn an honest day's living. (9:34, 43:23). They claim that they lead people to Allah's path, but the truth is that they block people from treading the path of Allah. They themselves become gods and thus do not allow anyone to reach Allah, but stop them on the way. The reason is simple: if Muslims make Allah's Quran their sole guide, then these pygmy tin gods would become redundant, irrelevant and non-existent!

The difference between secular and spiritual dominance is that the former disappears when a pharaoh, king or dictator dies, but the latter does not expire with the death of the dominance-seeker (wali, saint, sufi, etc.) Even from his grave he commands total obedience from the unthinking, gullible folk. In fact his stranglehold is powerful, his urge to dominate is overpowering. The living human is always in fear of the dead peer saheb's "spiritual powers". The peer's brainwashing and magnetic "power" may be likened to the flame which proves irresistible to the moths who keep circling it until they burn themselves completely. Allah rebutted man's fallacy and said to the living human:

"And they take besides Him gods who create naught, while they are themselves created, and they control for themselves no harm nor profit, and they control not death, nor life, nor raising to life." (25:3, 27:65, 46:4-5).

The question is: why are you afraid of them, and why do you pin your hopes and aspirations on them for worldly gains? This is extreme and abject humiliation for a man to be afraid of a corpse lying in the grave, and accept him as the granter and guarantor of all his needs.

SALAAT AND ZAKAAT

One effective way of making a man subordinate to another was to deprive him of the means of sustenance by sheer brute force, thus placing him in total servitude. The Quran declared in unequivocal terms:

"Say: Come! I will recite what your Lord has forbidden to you: associate naught with Him and do good to parents and slay not your children for (fear of) poverty – We provide for you and for them – and draw not nigh to indecencies, open or secret, and kill not the soul which Allah has made sacred except in the course of justice. This He enjoins upon you that you may understand." (6:152, 11:6, 17:31).

Through the agency of the Mu'mineen a system of government (Salaat) should be established which ensures an economic system (Zakaat) wherein every soul is guaranteed the basic necessities of life. No one will depend on another for his survival and no one will rule over the other.

These are the Quranic concepts and doctrines that gave man an honoured status and superiority over other creations. (17:70). Allah reminds mankind that if it safeguards itself from the pitfalls of wrong paths and evils and watches imbalances in society, then there are glad tidings for it from Him of a blissful life Here, and in the Hereafter. No fear, no constant torment and insecurity will be suffered by them. (2:37-38, 7:35, 10:62-64).

In this Quranic society, everyone- irrespective of race, colour or creed-will be equal in the eyes of the law and have an equal opportunity to develop his or her latent potentialities. There would be no favouritism, no

partisanship, no nepotism. Whoever wishes to progress in life by toil and endeavour, will achieve his aim; and whoever, owing to his own ineptitude and lethargy lags behind in this temporal life, then that will be to his own detriment. (46:19, 99:7-8).

In this just society there will be no distinction made between a child born with a silver spoon in his mouth, and a boy born in a poor family. In a Quranic society there will be no such thing that the former gets the best education and every luxury, whereas the latter cannot even get a rudimentary education because of poverty. This worldly hierarchical class division was created by Brahminism (priestcraft) that kept a section of society in its iron clutches. The Quran made mankind free from all this, and on this very basis proclaimed that:

"CELEBRATE AND REJOICE ON RECEIVING THIS CHARTER OF FREEDOM."

****

ENJOY YOUR STAY AT
HOTEL PARKWAY (PVT.) LTD.
NEAR RAILWAY STATION – LAHORE

ALL COMFORTS AVAILABLE:

- T.V. & FAX
- TELEPHONE EXCHANGE
- LIFT, INTERNET
- AIR-CONDITIONED
- CAR PARKING
- EXCELLENT SERVICE

PH:0092-42-36365908-12, FAX: 0092-42-36311923,
E-mail:hotel_parkway@yahoo.com